پاکستان

یہ ملک اسلامی جمہوریہ ہے ۔ مملکت کا دین اسلام ہے، اور آئین کے تحت ضروری ہے کہ تمام قوانین اسلام سے مطابقت رکھتے ہوں۔ آئین میں کہا گیا ہے کہ "قانون، امن عامہ، اور اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے، ہر شہری کو اپنے مذہب کا اظہار کرنے، اس پر عمل کرنے ، اور اس کی اشاعت کا حق حاصل ہوگا؛" عملی طور پر، مذہب کی آزادی پر حکومت کی طرف سے حدود عائد کی گئی ہیں۔ آئین کے تحت، آزادیٔ تقریر پر "اسلام کی عظمت کی خاطر، قانون کے تحت معقول نوعیت کی پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔"

اپنے سلوک کو زیر نظر رپورٹ کی تکمیل کے دوران، حکومت نے مذہبی اقلیتوں کے ساتھ بہتر بنانے کے لیئے کچھ اقدامات کیئے ۔ جمہوری طور پر منتخب حکومت نے ایک رومن کیتھولک کو وفاقی وزیر برائے اقلیتی امور مقرر کیا اور ان کے عہدے کو بڑھا کر کابینہ کے وزیر کے برابر کر دیا۔ حکومت نے تمام وفاقی ملازمتوں میں، پانچ فیصد کوٹہ اقلیتوں کے لیئے مخصوص کر دیا، اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی کہ صوبائی سطح پر وہ بھی ایسا اگست کو ملک بھر میں اقلیتوں کا دِن منایا 11ہی کریں۔حکومت نے یہ بھی طے کیا کہ ہر سال جائے گا۔ ان اقدامات کے باوجود سنگین مسائل باقی رہے۔ قانون نافذ کرنے والے عملے نے، مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے زیر حراست افراد کے ساتھ بد سلوکی کی ۔ سیکیورٹی فورسز نے اور دوسری سرکاری ایجنسیوں نے معاشرے کی طرف سے مذہبی اقلیتوں کے خلاف بد سلوکی کے واقعات کو روکنے یا ان کا مداوا کرنے کے لیئے کافی اقدامات نہیں کیئے ۔ امتیازی قانون سازی اور حکومت کی طرف سے معاشرے کے ان عناصر کے خلاف جن کا رویہ اکثریت کے مذہب سے مختلف عقائد رکھنے والے لوگوں کے بارے میں معاندانہ ہے، حکومت کی طرف سے کوئی اقدام نہ کیئے جانے کی بنا پر، مذہبی عدم رواداری، تشدد کی کارروائیوں، اور مذہبی اقلیتوں کو خوفزدہ کرنے کے واقعات کی حوصلہ افزائی ہوئی ۔مذہبی اقلیتوں کے خلاف مخصوص امتیازی قوانین میں احمدیوں کے خلاف اور توہین مذہب کے وہ قوانین شامل ہیں جن میں اسلام اور اس کے پیغمبروں کی بے حرمتی کرنے پر موت کی سزا رکھی گئی ہے ۔ احمدیہ کمیونٹی کو بدستور حکومت اور معاشرے کی طرف سے امتیازی سلوک کا سامنا رہا اور مذہبی عقائد پر عمل کرنے پر قانونی پابندیا ں عائد رہیں۔دوسرے اسلامی فرقوں نے بھی حکومت کی طرف سے امتیازی سلوک کا دعویٰ کیا۔

مذہبی برادریوں کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے ۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف معاشرے کی طرف سے امتیازی سلوک عام تھا، اور ان گروپوں کے خلاف معاشرے کے بعض عناصر کی طرف سے تشدد کا ارتکاب کیا گیا۔ دہشت گرد او ر انتہا پسند گروپوں اور افراد نے مذہبی اجتماعات کو نشانہ بنایا ۔ ملک کے اندر سنّی طالبان عناصر کی قیادت میں ہونے والی بغاوت کی وجہ سے مذہبی اقلیتوں کے خلاف تشدد کی کارروائیاں بڑ ھ گئیں، اور موجودہ فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہو گیا۔ انتہا پسندی پر مبنی بغاوت نے اکثریت پر اپنے مذہبی خیالات مسلط کرنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ انتہا پسندوں نے مطالبہ کیا کہ ترقی پسند نظریات رکھنے والے مسلمان، خاص طور سے عورتیں، اسلام کے ایک سخت ورژن پر عمل کریں۔ انھوں نے دھمکی دی کہ جو ایسا نہیں کرے گا اسے سنگین نتائج بھگتنے ہوں گے۔

امریکی حکومت انسانی حقوق کے فروغ کے لیئے اپنی مجموعی پالیسی کے جزو کے طور پر، مذہبی آزادی پر حکومت کے ساتھ بات چیت کرتی رہتی ہے۔ زیر نظر مدت کے دوران، امریکی سفارت خانے کے عہدے داروں نے مذہبی اقلیتوں کے ساتھ سلوک پر کڑی نظر رکھی،

مذہبی عدم رواداری کے پرچار کو ختم کرنے کی کوشش کی، اور توہین مذہب کے قوانین میں ترمیم کی حوصلہ افزائی کی۔

سیکشن I ۔ مذہب کے حوالے سے آبادی کے اعداد و شمار

ملک کا رقبہ 310,527 مربع میل ہے اور آبادی سترہ کروڑ تیس لاکھ ہے ۔ آبادی میں مذہب کی تقسیم کے سرکاری اعداد و شمار 1998 ءکی مردم شماری پر مبنی ہیں۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ آباد ی کا تقریباً 97 حصہ مسلمان ہے ۔ دو فیصد یا اس سے کم آبادی والے گروپوں میں احمدیوں سمیت، ہندو، عیسائی اور دوسرے شامل ہیں۔ ملک میں مسلمانوں کی اکثریت سنّی ہے جب کہ شیعہ اقلیت تقریباً 20 فیصد ہے۔ اقلیتی امور کی وزارت کے مطابق ، سکھوں کی تعداد تقریباً 30,000 اور بدھ مت کے ماننے والوں کی تعداد 20,000 ہے ۔ کراچی میں پارسیوں کے ایک کمیونٹی سینٹر کے مطابق، پارسیوں (زر تشت کو ماننےو الے) کی تعداد 2009 ءمیں کم ہو کر 1,822 رہ گئی جب کہ جون 2006 ء میں یہ تعداد 2039 تھی بہائیوں کا دعویٰ ہے کہ پاکستان میں ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی تعداد تقریباً 30,000 ہے ۔ جماعتِ احمدیہ کے مطابق، پاکستان میں رہنے والے احمدیوں کی تعداد تقریباً 600,000 ہے ۔ تاہم ان کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کیوں کہ احمدی جنہیں قانونی طور پر خود کو مسلمان کی حیثیت سے شناخت کرنے کی ممانعت ہے، عام طور سے خود کو غیر مسلم نہیں کہتے۔ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے (NWFP) کے بعض قبائل کے مذہبی عقائد روایتی مظاہر پرستی پر مبنی ہیں۔ بعض دوسرے مذہبی گروپوں میں کیلاش، Kihals , اور جینی شامل ہیں۔

1998 ءکی مردم شماری کے اعدا دو شمار کے مطابق، آبادی کا 0.5 فیصد سے بھی کم حصہ ایسا تھا جو مذہبی وابستگی کے بارے میں خاموش رہا یا جس کا یہ کہنا تھا کہ وہ کسی مخصوص مذہبی گروپ سے منسلک نہیں ہے۔ سماجی دباؤ اس قسم کا ہے، کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو یہ کہنے پر تیار ہوں گے کہ وہ کسی مذہب سے وابستہ نہیں ہیں۔

باقاعدہ مذہبی اجتماعات یا رسوم میں شرکت کے بارےمیں کوئی اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔روز مرہ زندگی میں اکثر مذہبی عقائد کا کردار اہم رہا۔ بیشتر مسلمان جمعے کے روز نماز پڑھتے ہیں، جو اسلام کا مقدس دِن ہے ۔ بہت سے لوگ روزانہ نماز پڑھتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں، ایسے مسلمان بھی جو مذہبی شعائر کی پابندی نہیں کرتے، روزہ رکھتے ہیں اور مذہبی اجتماعات میں شرکت کرتے ہیں۔ انگریزی بولنے والے تقریباً 70 فیصد رومن کیتھولک مذہب کے پیرو کارباقاعدگی سے عبادت کرتے ہیں۔ اردو بولنے والے کیتھولکس کی نسبتاً بہت کم تعداد ایسا کرتی ہے ۔ ہندوؤں اور سکھوں کے تہواروں کے زمانے میں مذہبی اجتماعات میں حاضری بڑھ جاتی ہے۔

سیکشن II ۔ حکومت کے طرف سے مذہبی آزادی کے احترام کی کیفیت

قانونی/ پالیسی کا ڈھانچہ

آئین میں اسلام کو مملکت کا مذہب قرار دیا گیا ہے ۔ اس میں یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ اقلیتوں کے اپنے مذہب سے وابستگی کے اظہار اور اپنے مذہبی عقائد پر آزادی سے عمل در آمد کرنے کے لیئے مناسب انتظامات کیئے جائیں گے۔ تا ہم، حکومت نے مذہبی آزادی پر، خاص طور سے احمدیوں پر، پابندیاں عائد کر دی ہیں۔

1974 ءکی ایک آئینی ترمیم میں اعلان کیا گیا ہے کہ احمدی غیر مسلم ہیں۔ سیکشن 298(c) کے تحت جسے عام طور سے '' احمدیوں کے خلاف قوانین'' کہا جاتا ہے ، احمدیوں کو خود کو مسلمان کہنے، اپنے مذہبی عقائد کو اسلام کا نام دینے، اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ اور اشاعت کرنے، دوسرے لوگوں کو احمدی تعلیمات قبول کرنے کی دعوت دینے، یا مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کی ممانعت ہے ۔ اِس سیکشن کی خلاف ورزی کرنے کی سزا تین سال قید تک اور جرمانہ ہے ۔دوسری مذہبی برادریاں عام طور سے اپنی مذہبی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیئے آزاد ہیں۔ تاہم، مذہبی اقلیتوں کو قانوناً بعض مذہبی نقوش اور تصویروں کی کھلے عام نمائش کی ممانعت ہے ، اور امتیازی قوانین اور سماجی دباؤ کی وجہ سے، وہ اکثر اپنے مذہبی عقائد کا آزادی سے اظہار کرنے سے ڈرتی ہیں۔

آزادیٔ تقریر پر '' عظمتِ اسلام'' کی خاطر بعض '' معقول''پابندیاں عائد ہیں۔ توہینِ مذہب کے ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے نتائج یہ ہیں: اسلام اور اس کے پیغمبروں کی توہین کرنے پر سزائے موت؛ قرآن شریف کے تقدس کو پامال کرنے، اسے نقصان پہنچانے، یا اس کی بے حرمتی کرنے پرعمر قید کی سزا؛ اور کسی دوسرے فرد کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے پر دس سال قید کی سزا۔ بعض افراد اپنی ذاتی دشمنیوں کا بدلہ لینے، یا کسی کمزور پہلو کے حامل مسلمانوں، یا مخالف فرقے کے لوگوں، اور مذہبی اقلیتوں کو خوفزدہ کرنے کے لیئے ان قوانین کے تحت الزامات عائد کر دیتے ہیں۔ انسدادِ دہشت گردی کے قانون کے تحت، تقریر سمیت کسی بھی ایسے اقدام پر جس کا مقصد مذہبی منافرت پر اکسانا ہو، سات سال قید تک کی سزا دی جا سکتی ہے ۔ اس قانون کے تحت، اگر جج کے پاس یہ سمجھنے کی معقول وجوہات موجود ہوں کہ ملزم نے جرم کا ارتکاب کیا ہے، تو ضمانت منظور نہیں کی جا سکتی؛ تا ہم، اس قانون کی ضمانت کی شق کا اطلاق جج کی صوابدید پر ہوتا ہے۔

کوئی بھی تقریر یا طرزِ عمل جس سے کسی دوسرے فرد کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہوں، ممنوع ہے اور اس کی سزا قید ہے۔ اس میں اقلیتی مذہبی گروپوں کے مذہبی جذبات بھی شامل ہیں۔ تا ہم، ایسے کیسوں میں جن میں کسی اقلیتی گروپ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، توہینِ مذہب کے قوانین کا شا ذو نادر ہی اطلاق کیا جاتا ہے ، اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ قانونی نظام کے تحت کارروائی کی گئی ہو۔2005 ءکے ایک قانون کے تحت ضروری ہے کہ اس سے پہلے کہ شکایت درج کی جائے، ایک سینیئر پولیس افسر توہینِ مذہب کے الزام کی تفتیش کرے۔غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کے مطابق، اس قانون کا اطلاق سب پر یکساں طور پر نہیں کیا گیا ہے۔

فوجداری قانون میں اسلامی قانون (شریعت) کی کئی شقیں شامل ہیں۔ عدلیہ کے نظام میں کئی قسم کے عدالتی نظام شامل ہیں جن کے دائرہ اختیار ایک دوسرے سے متجاوز ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ان میں آپس میں مقابلہ ہوتا ہے۔ ان عدالتوں کے دائرہ کار سے سول، فوجداری، اور اسلامی فلسفۂ قانون کی عکاسی ہوتی ہے۔وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کی شریعت بینچ

،بعض ایسے کیسوں میں جن میں کسی فوجداری عدالت میں حدود آرڈیننینس کے تحت سزا مِل چکی ہو، اپیل کی عدالت کے طور پر کام کرتی ہیں۔ حدود آرڈیننینس میں زنا بالجبر، شادی کے بغیر جنسی تعلقات، جائیداد سے متعلق جرائم، شراب نوشی اور جوئے کو جُرم قرار دیا گیا ہے ۔ ان عدالتوں کے ججوں اور وکلا کا مسلمان ہونا ضروری ہے ۔ وفاقی شرعی عدالت کسی بھی ایسے قانون کو جو اس کی نظر میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہو، کالعدم قرار دے سکتی ہے ۔ تاہم مارچ 2005 ءمیں، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے فیصلہ دیا کہ وفاقی شرعی عدالت کے پاس صوبائی ہائی کورٹ کے فیصلے پرنظر ثانی کا کوئی اختیار نہیں تھا، چاہے وفاقی شرعی عدالت، ابتدائی اپیل سننے کا اختیار کیوں نہ رکھتی ہو۔

فوجداری قانون کے تحت مجرموں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ متاثرین کو زرِ تلافی پیش کر سکیں اور عدالتی نظام کے ذریعے سزا دلوانے کے بجائے، متاثرین کو مجرموں کے خلاف جسمانی طور پر انتقامی کارروائی کی اجازت ہے ۔ "قصاص اور دیت" کے قانون کے تحت یا تو قتل اور دوسرے پُر تشدد جرائم کے جواب میں انتقامی کارروائی (قصاص) یا مجرمانہ کارروائی کا شکار ہونے والے فرد کو زرتلافی (دیت) کی اجازت ہے ۔مذہبی اقلیتوں کا دعویٰ ہے کہ اقلیتی مجرموں کے لیئے زرِ تلافی کی رقم بہت زیادہ تھی اور اقلیتی متاثرین کے لیئے مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں کم تھی۔

2006 ءکے عورتوں کے تحفظ کے قانون کے تحت حدود آرڈیننینس میں ترمیم کی گئی اور زنا بالجبر اور بدکاری کے مقدمات کو شرعی عدالتوں سے غیر مذہبی عدالتوں میں منتقل کر دیا گیا۔ شروع میں حدود آرڈیننینس کے تحت اکثر شہادت اور سزا کے قرآنی معیاروں کی سخت اور امتیاز سے پُر توجیحات پر انحصار کیا جاتا تھا اور ان کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم دونوں پر کیا جاتا تھا۔اگر قرآنی معیار استعمال کیے جائیں، تو مسلم اور غیر مسلم مرد اور عورت کی گواہی کا وزن مختلف ہوتا ہے ۔جب سے سابق صدر مشرف نے حکم دیا ہے کہ حدود آرڈیننینس کے تحت قید کی جانے والی تمام عورتیں رہا کر دی جائیں ، اس وقت سے اب تک تقریباً 2,500 عورتیں رہا کی جا چکی ہیں۔ ان میں سے بہت سی اپنے گھروں کو سماجی مقاطعے کی بنا پر واپس نہیں جا سکیں۔ چند ایسی تھیں جو زیرِ حراست رہیں، اور بیشتر کو سرکاری انتظام میں چلنے والی پناہ گاہوں میں رکھا گیا۔جن عورتوں کو شروع میں حدود آرڈیننینس کے تحت زنا، بد کاری، اور شراب اپنے پاس رکھنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا، اب ان کے مقدمے عورتوں کےتحفظ کے قانون کے تحت سنے جا رہے ہیں۔ سوسائٹی فار ہیومن رائٹس اینڈ پرزنرز ایڈ کے مطابق، عورتوں کے خلاف بد کاری سے متعلق کیسوں کی تعداد میں 2008-09 ءکے دوران خاصی کمی ہوئی ہے ۔

حکومت پاسپورٹوں پر مذہبی وابستگی تحریر کرتی ہے اور قومی شناختی کارڈ کی درخواستوں پر مذہب کے بارے میں معلومات طلب کرتی ہے ۔ووٹ دینے کے لیئے ہر شہری کے پاس قومی شناختی کارڈ ہونا چاہیئے ۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا شمار مسلمانوں میں کیا جائے، انہیں حلفیہ اپنا یہ عقیدہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ محمد آخری نبی ہیں اور احمدیہ تحریک کے بانی کی جھوٹے نبی کے طور پر مذمت کرنا ہوتی ہے اور اس کے ماننے والوں کو غیر مسلم کہنا ہوتا ہے۔ اس شق کا مقصد احمدیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرنا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ احمدی انتخابات کا بائیکاٹ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

آئین میں "مذہبی اداروں کا انتظام کرنے کی آزادی" فراہم کی گئی ہے ۔ اصولاً ، حکومت منظم مذہبی گروپوں کو عبادت گاہیں قائم کرنے اور مذہبی عملے کی تربیت پر پابندی نہیں لگاتی۔ تا ہم عملی طور پر، مذہبی اقلیتوں کے اس حق پر پابندیاں عائد ہیں۔ ضلع کی سطح پر حکام نے ، امن و امان قائم رکھنے کی ضرورت کا حوالہ دیتے ہوئے، غیر مسلموں، خاص طور سے احمدی اور بہائی کمیونٹیوں کو عبادت گاہوں کی تعمیر کی اجازت دینے سے مسلسل انکار کیا ہے ۔ سرکاری طور پر احمدیہ عبادت گاہوں کی تعمیر پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تا ہم، احمدیوں کو انہیں مسجد کہنے کی ممانعت ہے ۔ ضلعی حکومتیں اکثر احمدیوں کو اپنے اجتماعات پبلک مقامات پر منعقد کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اس لیئے وہ اپنے اجتماعات ممبروں کے گھروں کے اندر کرتے ہیں۔ اگر ہمسایے قرآنی آیات کی تلاوت کو سننے کی اطلاع دیں، تو حکومت ان اجتماعات پر پابندی لگا سکتی ہے ۔

حکومت مسجدوں کی تعمیر اور ان کی دیکھ بھال، اور اسلامی مذہبی عملے کے لیئے فنڈ فراہم کرتی ہے ۔ اقلیتی کمیونٹیوں کی بعض مذہبی املاک کی قانونی ذمے داری، جنہیں 1947 ءمیں پاکستان اور بھارت کی تقسیم کے وقت خالی چھوڑ دیا گیا تھا، صوبائی اور وفاقی حکومتوں پر ہے ۔ اقلیتی کمیونٹیوں کا دعویٰ ہے کہ حکومت نے ان املاک کی حفاظت اور دیکھ بھال پر کافی رقم خرچ نہیں کی۔ حکومت نے 2.5 فیصد ٹیکس (زکواۃ) تمام سنی مسلمانوں سے جمع کیا، اور ان رقوم کو سنّی مسجدوں، مدرسوں اور فلاحی تنظیموں پر خرچ کیا۔ دوسرے مذہبی گروپوں پر اس قسم کا کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا گیا ہے ۔

حکومت کی پالیسیوں سے اکثریتی اور اقلیتی مذہبی گروپوں کو برابر کا تحفظ نہیں ملتا ۔ وزارتِ مذہبی امور، زکوا ۃ اور عشر، بنیادی طور پر مذہبی آزادی کے تحفظ کے علاوہ ، حج اور دوسری اسلامی زیارتوں میں شرکت کو منظم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس وزارت کا کہنا ہے کہ وہ اپنے سالانہ بجٹ کا 30 فیصد حصہ ضرورت مند اقلیتوں کی مدد، اقلیتوں کی عبادت گاہوں کی مرمت، اقلیتوں کے زیر انتظام چلنے والے ترقیاتی منصوبوں کے قیام، اور اقلیتوں کے تہواروں کے منانے پر خرچ کرتی ہے ۔ مذہبی اقلیتوں نے ان اعداد وشمار پر شک و شبے کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایسی بستیوں اور گاؤں میں جہاں اقلیتی شہری رہتے ہیں، زندگی کی بنیادی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ اس وزارت کی عمارت کی پیشانی پر یہ قرآنی آیت درج ہے: "صرف اسلام ہی اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔"

وزارتِ اقلیتی امور 2004 ءسے صرف اسی ایک شعبے کی ذمے دار ہے۔ اس وزارت کا مقصد "اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے جیسا کہ پاکستان کے 1973 ءکے آئین میں بیان کیا گیا ہے۔" نومبر 2008ء میں ایک رومن کیتھولک، شہباز بھٹی کو وفاقی وزیر برائے اقلیتی امور مقرر کیا گیا۔ عیسائی کمیونٹی اور دوسرے مذہبی گروپوں نے پورے پاکستان میں اس اقدام کا خیر مقدم کیا۔یہ پہلا موقع تھا کہ اس عہدے کو وفاقی کابینہ کے رکن کا درجہ دیا گیا تھا۔ ماضی میں، اقلیتوں کا قلمدان وزارت نسبتاً نیچے درجے کے عہدے دار کو دیا جاتا تھا جو کسی دوسرے وفاقی وزیر کے تحت کام کرتے تھے۔

حکومت اسلامی مقدس دنوں کو قومی تہواروں کے طور پر مناتی ہے۔

آئین میں" مذہب کے معاملے میں تعلیمی اداروں کو تحفظ" فراہم کیا گیا ہے ۔ کسی طالب علم کو اپنے مذہب کے سوا، کسی دوسرے مذہب کی تدریس یا مذہبی عبادت میں شرکت کے لیئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی مذہبی کمیونٹی یا فرقے کو مذہبی تعلیم سے محروم کرنے کی بھی ممانعت ہے ۔

سرکاری اسکولوں میں تمام مسلمان طالب علموں کے لیئے اسلامیات (اسلامی علوم)لازمی مضمون ہے ۔ اگرچہ دوسرے مذہبی گروپوں کے طالب علموں کے لیئے قانونی طور پر اسلام کا مطالعہ ضروری نہیں ہے ، لیکن انہیں اسی قسم کا مطالعے کا پروگرام، اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں پیش نہیں کیا جاتا۔ بعض اسکولوں میں، غیر مسلم طالب علم اخلاقیات کا مضمون پڑھ سکتے ہیں۔

آئین میں کسی بھی سرکاری ادارے میں صرف مذہبی وابستگی کی بنیاد پر امتیازی داخلے کی بالصراحت ممانعت کی گئی ہے ۔ سرکاری عہدے داروں نے بیان کیا کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلے میں صرف طالب علموں کے گریڈز اور ان کے اپنے صوبوں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے ؛ تا ہم طالب علموں پر لازم ہے کہ وہ درخواست فارموں میں اپنی مذہبی وابستگی کو بیان کریں۔ یہ اعلان یونیورسٹیوں سمیت نجی تعلیمی اداروں کے لیئے بھی لازمی ہے ۔ مسلمان طالب علموں کو تحریری طور پر اعلان کرنا چاہیئے کہ وہ پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایک اور طریقہ ہے جو احمدیوں کو دوسروں سے الگ کرتا ہے۔ غیر مسلموں کو اپنی مذہبی وابستگی کی تصدیق اپنی مقامی مذہبی کمیونٹی کے سربراہ سے کرانا لازمی ہے۔

والدین اپنے گھرانے کے خرچ پر، بچوں کو مذہبی اسکولوں میں بھیج سکتے ہیں۔ نجی اسکولوں کو آزادی ہے کہ وہ مذہبی علوم کی تعلیم دیں یا نہ دیں۔

اسلامی اسکول یا مدرسے، ایسے مسلمانوں کے لیئے روایتی ادارے ہیں جو صرف مذہبی تعلیم حاصل کرنا چاہتےہیں۔ بہت سی دیہی بستیوں میں، تعلیم کے لیئے صرف مدرسے ہی دستیاب ہیں۔حالیہ برسوں کے دوران، بعض مدرسوں نے دہشت گردی کی حمایت میں انتہا پسند نظریے کی تعلیم دی ہے ۔ انتہا پسندی کو پھیلنے سے روکنے کے کوشش میں، 2002 ءکے مدرسہ رجسٹریشن آرڈی نینس کے تحت ضروری ہے کہ تمام مدرسے پانچ میں سے ایک غیر جانبدار رجسٹریشن بورڈز (وفاق) میں رجسٹریشن کرائیں، بیرونی ملکوں سے پیسہ لینا بند کریں، اور غیر ملکی طالب علموں کو صرف اپنی حکومت کی منظوری سے قبول کریں۔ زیر نظر مدت کے آخر تک، تقریباً 15,275 مدرسوں نے رجسٹریشن کرائی تھی۔ تا ہم، سول سوسائٹی کی بہت سے تنظیمیں اور تعلیمی ماہرین ، رجسٹر شدہ اور غیر رجسٹر شدہ مدرسوں کی تعداد کو صحیح تسلیم نہیں کرتے ۔

2005 ءمیں باہم تعاون سے مدرسوں کی رجسٹریشن کا ایک طریقہ کار وضع کیا گیا تھا۔ اس میں مالی اور تعلیمی اعداد و شمار کی فراہمی، اور فرقہ وارانہ یا مذہبی منافرت اور تشدد کی تعلیم پر پابندی شامل تھی۔ تا ہم سیاسی ہنگاموں اور پچھلی حکومت میں دائرۂ اختیار کے جھگڑوں کی وجہ سے اس طریقہ کار پر عمل درآمد رکا رہا۔ حکومت اور غیر جانب دار مدرسہ بورڈوں نے ریاضی، انگریزی اور سائنس سمیت سیکولر مضامین کو بتدریج تمام

مدرسوں میں متعارف کرانے پر اتفاق کیا تھا۔2008 ءمیں بر سر اقتدار آنے والی حکومت نے مدرسوں میں اصلاح کو ایک ترجیح قرار دیا ہے ۔

حکومت نے تمام مدرسوں کے لیئے یکساں ، اور زیادہ سیکولر انداز کے نصاب کا اعلان کیا ہے لیکن اسے اب تک منظور نہیں کیا ہے ۔فیڈرل مدرسہ بورڈ (وفاق المدارس) کے چیف سیکریٹری، مولانا محمد حنیف جالندھری نے اپریل 2009 ءمیں اس پالیسی کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کی طرف سے کسی مداخلت کو برداشت نہیں کیا جائے گا، اور مدرسوں کے نصاب میں کسی نظر ثانی کو بورڈ کے مشورے اور منظوری کے بغیر قبول نہیں کیا جائے گا۔

تمام وفاقوں (مدرسوں کے رجسٹریشن بورڈز) نے ایسی تمام تعلیمات کو لازمی طور پر ختم کرنے کا حکم جاری رکھا جن سے مذہبی یا فرقہ وارانہ عدم رواداری ، دہشت گردی یا مدرسوں میں انتہاپسندوں کی بھرتی کو فروغ ملتا ہو۔ انسپکٹروں نے حکم دیا کہ تمام الحاق شدہ مدرسے مذہبی علوم کے ساتھ سیکولر مضامین کی تعلیم بھی دیں۔ وفاقوں نے بیرونی ممالک سے مدرسوں کی نجی سطح کی مالی امداد پر بھی پابندی لگا دی۔ مدرسوں کی جانچ کے بارے میں حکومت کے ساتھ سرگرمی سے بات چیت ہوتی رہی۔ وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (FATA)، کراچی، اور شمالی بلوچستان میں بعض غیر رجسٹر شدہ اور دیوبندی مسلک کے مدرسوں میں، انتہا پسندی کی تعلیم دی جاتی رہی۔ اسی طرح، دعویٰ اسکولوں نے جنہیں جماعت الدعویٰ ، چلاتی ہے ، اس قسم کی تعلیمات اور لشکر ِ طیبہ کے لیئے بھرتی جاری رکھی۔ جماعت الدعویٰ کالعدم لشکر طیبہ کا دوسرا نام ہے جسے غیرملکی دہشت گرد تنظیم قرار دیا جا چکا ہے ۔نومبر 2008 ءمیں، ممبئی، بھارت میں دہشت گردوں کے حملوں کے بعد ، جو لشکر ِ طیبہ سے منسوب کیئے گئے تھے، صوبہ پنجاب کی حکومت نے جماعت الدعویٰ کے کئی اداروں کا انتظام سنبھال لیا۔

وادی�ٔ سوات میں طالبان کا تشدد ختم کرنے کے لیئے ، شمال مغربی سرحدی صوبے کی حکومت نے عوامی نیشنل پارٹی (ANP)کی قیادت میں، فروری 2009 ءمیں انتہا پسند تنظیم تحریک ِ نفاذِ شریعتِ محمدی (TNSM) کے ساتھ ایک امن سمجھوتہ کیا ۔ اس سمجھوتے میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے مالا کنڈ ڈویژن میں نظام ِ عدل ریگولیشن (NAR) پر عمل درآمد کرنے کا عہد شامل تھا۔ اپریل 2009 ءمیں صدر آصف علی زرداری نے نظام ِ عدل ریگولیشن (NAR) پر دستخط کر دیے، اور اسے مؤثر کر دیا۔1994 ءاور 1998 ءمیں شریعت قائم کرنے کی جو کوششیں کی گئی تھیں (مقامی طور پر اسے جلد انصاف سمجھا گیا تھا) ان کی بنیاد پر نظام ِ عدل ریگولیشن (NAR) دیوانی اور فوجداری مقدمات طے کرنے کی حدود متعین کرتا ہے، مملکت کے منتخب کردہ قاضیوں (مذہبی جج) کو دوبارہ قائم کرتا ہے، اور ایک مقامی اپیل کورٹ قائم کرتا ہے جس کے ججوں کا انتخاب پشاور ہائی کورٹ کرتی ہے ۔سول سوسائٹی نے عام طور پر، اور اقلیتی مذہبی کمیونٹی نے خاص طور پر، سوات میں مذہب کی بنیاد پر انصاف کے ایک متبادل نظام کے قیام کے اثرات پر تشویش کا اظہار کیا۔ نظام ِ عدل ریگولیشن (NAR) کا دفاع کرنے والوں نے توجہ دلائی کہ آئین کے تحت، پہلے ہی تمام قوانین اسلام کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اس لحاظ سے، نظام ِ عدل ریگولیشن (NAR) کوئی نیا ضابطہ نہیں ہے ۔

اس سمجھوتے پر اس توقع کے ساتھ دستخط کیئے گئے تھے کہ مقامی عسکریت پسند، نظامِ عدل ریگولیشن (NAR) کے ذریعے شریعت کے نظام پر عمل در آمد کے عوض غیر مسلح ہو جائیں گے۔ تا ہم، صدر کے نظامِ عدل ریگولیشن (NAR) پر دستخط کے بعد، عسکریت پسندوں نے غیر مسلح ہونے سے انکار کر دیا، اور اپنے گشت کی کارروائیاں مالاکنڈ ڈویژن کے ڈسٹرکٹ بونیر تک بڑھادیں۔ عسکریت پسندوں کی طرف سے تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پیشِ نظر، فوج نے26 اپریل ، 2009 ءکو فوجی کارروائی شروع کردی۔ اس کے نتیجے میں تقسیم کے بعد سے ملکی تاریخ کی سب سے بڑے پیمانے پر نقلِ مکانی ہوئی، اور طالبان کے زیرِ کنٹرول بیشتر علاقے کو آزاد کرا لیا گیا ۔

زیرِ نظر مدت کے اختتام پر، فوج مالاکنڈ میں اپنی کارروائیاں مکمل کر رہی تھی، اور یہ علاقہ شمال مغربی سرحدی صوبے کی حکومت کے کنٹرول میں واپس آگیا تھا، لیکن نظامِ عدل ریگولیشن (NAR) پر اب تک عمل درآمد نہیں ہوا تھا۔

حکومت عام طور سے مذہبی مطبوعات پر پابندی عائد نہیں کرتی۔ تا ہم، احمدیوں کے مذہبی لٹریچر کی فروخت ممنوع ہے ۔ قانون نے کے تحت اسلام یا اس کے پیغمبروں پر کسی بھی قسم کی تنقید کی اشاعت یا کسی دوسرے فرد کے مذہبی عقائد کی توہین کرنا ممنوع ہے۔

اعلیٰ ترین سطحوں پر، حکومت بین المذاہب مکالمے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر زور دیتی رہی تا کہ اعتدال پسندی، رواداری، اور اقلیتوں کے حقوق کو فروغ دیا جائے۔

بچوں کو اپنی مرضی کی مذہبی تعلیمات دینے اور اپنی پسند کے طریقوں کے مطابق پرورش کرنے پر والدین پر حکومت کی طرف سے کوئی ممانعت ، پابندی یا سزا نہیں دی جاتی۔نہ ہی حکومت نے والدین کو اپنے گھر کے اندر بچوں کو مذہبی تعلیم دینے سے روکنے کے لیئے کوئی اقدامات کیئے ہیں۔

قانونی طور پر ایسی کوئی شرط نہیں ہے کہ کوئی فرد کسی مذہبی گروپ کے طریقے کے مطابق عمل کرے یا برائے نام کسی سے وابستہ ہوتا ہم، آئین کے تحت صدر اور وزیر اعظم کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ پارلیمنٹ کے ارکان سمیت تمام اعلیٰ سرکاری عہدے داروں کے لیئے ملک کے اسلامی تشخص کی حفاظت کا حلف اٹھانا ضروری ہے ۔سرکاری ملازمین کو اپنے عقیدے کے کسی عنصر کی نمائش کرنے یا اس پر عمل کرنے کی ممانعت نہیں ہے ۔

مبلغین (احمدیوں کے سوا) کو ملک میں آنے کی اجازت ہے اور جب تک اسلام کے خلاف تبلیغ نہ کی جائے، اور مبلغین اعتراف کریں کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، وہ لوگوں کا مذہب تبدیل کر سکتے ہیں۔ مبلغین کے لیئے ضروری ہے کہ ان کے پاس مخصوص ویزے ہوں جو دو سے پانچ برس تک کے لیئے درست ہوں اور انہیں سال میں ایک مرتبہ ملک میں داخلے کی اجازت ہوتی ہے ۔ صرف "متبادل " ویزا جو رخصت ہونے والے مبلغین کے لیئے جاری کیئے جائیں، دستیاب ہیں، اور طویل تاخیر اور دفتری مسائل عام ہیں۔

انسدادِ دہشت گردی کے قانون کے مطابق، حکومت نے کئی مذہبی انتہا پسند اور دہشت گرد گروپوں کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی اور ان کی رکنیت کو ممنوع قرار دے دیا۔ انسدادِ دہشت گردی کے قانون کے تحت پُر تشدد جرائم، دہشت گردوں کی سرگرمیوں ، کارروائیوں

یا ایسی تقریر جس کا مقصد مذہبی منافرت کو ہوا دینا ہو، اور مملکت کے خلاف جرائم پر، حکومت کو تیزی سے کام کرنے والی خصوصی عدالتوں میں مقدمے چلانے کی اجازت ہے ۔تا ہم، بہت سے گروپوں نے جنہیں حکومت نے ممنوع قرار دے دیا ہے، اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہیں۔

حکومت سول یا کامن لا یعنی غیر رسمی شادیوں کو تسلیم نہیں کرتی۔ شادیاں لوگوں کے مذہبی گروپ کے مطابق انجام دی جاتی ہیں اور رجسٹر کی جاتی ہیں۔ غیر مسلم مردوں کی شادیاں ان کے مذہبِ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی قانونی رہتی ہیں۔ اگر کوئی غیر مسلم عورت مذہب تبدیل کر لیتی ہے اور مسلمان ہو جاتی ہے ، اور اس کی شادی اس کے پہلے مذہبی عقیدے کے مطابق ہوئی تھی، تو وہ شادی فسخ ہو جاتی ہے۔ ہندو یا عیسائی عورتیں جو شادی کے بعد مسلمان ہو جاتی ہیں، ان کے بچے نا جائز تصور کیے جاتے ہیں جب تک کہ ان کے شوہر بھی اپنا مذہب تبدیل نہیں کرلیتے۔ شادی کو جائز قرار دیے جانے، اور بچوں کو ورثے کا اہل قرار دیےجانے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ شوہر مذہب تبدیل کرے اور مسلمان ہو جائے۔ایسے مسلمان مرد اور مسلمان عورت کے بچے، جو کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیتےہیں، نا جائز تصور کیے جاتے ہیں، اور حکومت بچوں کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے ۔

حکومت نے کسی مخصوص مذہبی گروپ ، مذہبی عقیدے، یا مذہبی نظریے کی توجیح کی بنیاد پر سیاسی پارٹیوں کی تشکیل پر پابندی نہیں لگائی۔ حکومت نے دہشت گرد اور انتہا پسند تنظیموں سے پرانے رابطوں کی وجہ سے، مختلف اسلامی پارٹیوں اور ان کے مذہبی کارکنوں کی سرگرمیوں کی نگرانی کی۔ قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں میں مذہبی اقلیتوں کے ارکان کے لیئے مخصوص نشستیں ہیں۔ یہ نشستیں سیاسی پارٹیوں کو متناسب بنیاد پر دی جاتی ہیں جس کا تعین اسمبلی میں ان کی مجموعی نمائندگی سے کیا جاتا ہے ۔ قومی اسمبلی میں اقلیتی مذہبی گروپوں کے 10 ارکان ہیں، اور یونین کونسل، تحصیل کونسل، اور ڈسٹرکٹ کونسلوں سمیت، مقامی حکومت کی بیشتر سطحوں میں اقلیتوں کی نمائندگی ہوتی ہے ۔ اقلیتیں صوبائی اسمبلیوں میں بھی منتخب ہوئی تھیں: شمالی مغربی سرحدی صوبے میں تین غیر مسلم، آٹھ پنجاب میں، نو سندھ میں، اور تین بلوچستان میں۔

مذہبی آزادی پر پابندیاں

حکومت نے عام طور سے مذہبی آزادیوں پر موجودہ قانونی پابندیوں کا نفاذ کیا۔

1983 ءسے احمدیوں پر اپنی عوامی کانفرنسیں یا اجتماعات منعقد کرنے اور اپنی سالانہ کانفرنس کا انعقاد کرنے پر پابندی لگی رہی ہے ۔ احمدیوں کے لیئے مذہبی تبلیغ ممنوع ہے اور حج یا دوسری مذہبی زیارتوں کے لیئے، انہیں سعودی عرب کا سفر کرنے کی ممانعت ہے ۔ احمدیہ مطبوعات کو عوام میں فروخت کرنا ممنوع ہے، لیکن انھوں نے محدود پیمانے پر تقسیم کے لیئے بڑی مقدار میں مذہبی لٹریچر شائع کیا۔

آئین میں عبادت گاہیں قائم کرنے اور مذہبی کارکنوں کو تربیت دینے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ لیکن عملی طور پر ، احمدیوں کے لیئے ان حقوق پر پابندی لگی رہی۔ میڈیا کی رپورٹوں کے مطابق، حکام نے احمدیوں اور ان کے اداروں کی نگرانی جاری رکھی۔

اطلاعات کے مطابق، کئی احمدیہ مسجدیں بند کر دی گئیں۔بعض دوسری مسجدوں کی بےحرمتی کی گئی یا ا ن کی تعمیر روک دی گئی۔

عوامی دباؤ کی وجہ سے عدالتیں عموماً اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت نہ کر سکیں، اور جج قدامت پسند سنی عناصر کو محسوس ہونے والی زیادتیوں پر سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہوئے ۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف امتیازی سلوک کے الزامات شا ذو نادر ہی عدلیہ کے سامنے لائے گئے ۔ کئی غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق، زیر نظر مدت میں، عیسائیوں اور احمدیوں کے خلاف مقدمات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا؛ تا ہم، پچھلی زیر نظر مدتوں کے مقابلے میں، عدلیہ نے، نچلی سطح پر بھی، ان مقدموں کے بارے میں زیادہ منصفانہ رویہ اختیار کیا ۔ غیر سرکاری تنظیموں نے اطلاع دی کہ مقامی عیسائیوں اور ہندو کمیونٹیوں کے خلاف مقدمے جاری رہے لیکن ا ن کی تعداد میں کمی آئی اور اونچی سطحوں پر سماجی امتیاز باقی رہا۔ عام طور سے مقدمہ درج کیئے جانے اور عدالت میں پہلی پیشی کے درمیان طویل عرصہ گذرتا رہا۔ زیریں عدالتوں کو اکثر خوف و ہراس کا سامنا رہا، ان کے فیصلے تاخیر سے جاری کیئے گئے، اور انھوں نے انتہا پسند عناصر کی طرف سے انتقامی کارروائی کے ڈر سے، ملزموں کو ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ جن عدالتوں میں ابتدائی مقدمے درج ہوئے، انھوں نے عموماً توہینِ مذہب کے کیسوں میں ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ موت کی سزا کا سامنا کرنے والے ملزمان کے فرار ہونے کا امکان ہے۔ جیسا کہ ملک میں اکثر مقدموں میں ہوتا ہے، بہت سے ملزمان نے ضمانت سے انکار کے خلاف اپیل کی، لیکن مقدمے سے پہلے اکثر ضمانت منظور نہیں کی گئی۔

پچھلی زیر نظر مدتوں کے بر خلاف، اس بارضلعی حکومتوں کی طرف سے بعض مذہبی نشانیوں مثلاً مقدس تثلیث اور یسوع مسیح کے نقش کی تقسیم اور نمائش پر پابندی کی رپورٹیں نہیں ملیں ۔ عیسائی بستیوں میں اس قسم کے نقوش کھلے عام دکھائے اور فروخت کیئے گئے ۔

بر سر اقتدار پارٹی اور حکومت کی مخالف اعتدال پسند پارٹیوں کی رکنیت کے لیئے کسی مذہبی عقیدے یا کسی مخصوص مذہبی گروپ سے وابستگی ضروری نہیں تھی۔ مذہبی پارٹیوں کے سوا تمام سیاسی پارٹیوں میں اقلیتوں کا ایک علیحدہ شعبہ تھا۔

غیر ملکی کتابوں کی دوبارہ چھپائی سے پہلے ان کا سرکاری سینسر سے پاس ہونا ضروری ہے ۔ کتابیں اور رسالے آزادانہ طور سے در آمد کیئے گئے لیکن ان میں قابلِ اعتراض جنسی یا مذہبی مواد کی جانچ کے لیئے ان کا سینسر ہونا ضروری تھا۔

حکومت نے کبھی کبھی حج کے سفر کے لیئے فنڈ دیے اور آسانیاں فراہم کیں لیکن مذہبی اقلیتوں کے لیئے اسی قسم کے زیارتوں کے سفر کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ چونکہ پاسپورٹ میں مذہبی وابستگی بیان کرنا اور احمدی نبی کی مذمت کرنا ضروری ہے ، اس لیئے احمدیوں کے حج پر جانے پر پابندی تھی کیوں کہ وہ خود کو مسلمان نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ حکومت اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتی، مذاہب کے ماننے والے چاہے ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، زیارتوں کے لیئے اسرائیل نہیں جا سکتے۔ اس پابندی سے بہائی خاص طور سے متاثر ہوئے کیوں کہ بہائی کمیونٹی کا روحانی اور انتظامی مرکز، بہائی ورلڈ سینٹر، شمالی اسرائیل میں واقع ہے ۔

اگرچہ زیرِ نظر مدت کے دوران، خاص طور سے ہندوؤں کے خلاف امتیازی سلوک جاری رہا، تا ہم جب احمدیوں اور عیسائیوں نے یونیورسٹیوں اور میڈیکل کالجوں میں داخلے کی درخواستیں دیں، تو ان کے خلاف امتیازی برتاؤ کی کوئی رپورٹ نہیں ملی۔اس عرصے کے دوران، شیعہ لیڈروں نے کہا کہ سول سروس کی ملازمتوں یا اعلیٰ تعلیم کے سرکاری اداروں میں ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا۔

سول سروس میں تمام اقلیتی گروپوں کی ترقیاں بظاہر محدود رہیں۔ یہ مسائل خصوصاً احمدیوں کے لیئے شدید تھے جنھوں نے کہا کہ امتیازی سلوک کی وجہ سے اعلیٰ عہدوں پر ان کی ترقی نہیں ہوئی اور بعض سرکاری محکموں نے اہل احمدیوں کو ملازمت دینے یا ملازمت میں باقی رکھنے سے انکار کر دیا۔ حکومت نے بعض گروپوں کے خلاف امتیازی سلوک کیا، جیسے سرکاری مسجدوں کے عملے اور سرکاری اسلامیہ کالجوں کے تدریسی عملے کی بھرتی میں اہلِ حدیث اور بریلویوں کے درمیان امتیازی سلوک کیا گیا۔

اقلیتی مذہبی گروپوں کے ارکان کی چھوٹی سی تعداد نے فوج میں ملازمت کے لیئے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں، اور ان کی ترقی میں سرکاری طور پر کوئی رکاوٹیں نہیں تھیں۔تا ہم عملی طور پر، غیر مسلم شاذونادر ہی کرنل کے عہدے سے اوپر پہنچ سکے اور انہیں سیاسی طور پر حساس عہدے نہیں دیے گئے۔ مسلمان سپاہیوں کے لیئے فوج میں مذہبی کور کا بندوبست تھا، لیکن اس قسم کی خدمات مذہبی اقلیتوں کو فراہم نہیں کی گئیں۔

سرکاری اسکولوں کے نصاب کی درسی کتابوں میں اقلیتی مذہبی گروپوں، خاص طور سے احمدیوں، ہندوؤں، اور یہودیوں کے خلاف اہانت آمیز مواد شامل تھا، اور مذہبی عدم رواداری کی تعلیم عام تھی۔ حکومت اس قسم کی تعلیمات کو حذ ف کرنے اور سیکولر مضامین میں سے مذہبی رنگ کو دور کرنے کے لیئے نصاب پر نظرِ ثانی کرتی رہی۔

عبادت گاہوں کی تعمیر یا زمین حاصل کرنے کے لیئے مذہبی گروپوں کی درخواستوں پر کارروائی میں تاخیر کے لیئے سرکاری عہدے داروں نے دفتری ہتھکنڈےاستعمال کیے اور رشوت طلب کی۔ اگرچہ احمدیوں کو عبادت گاہیں تعمیر کرنے سے روک دیا گیا، لیکن سنّی مسلمان گروپوں نے حکومت کی اجازت کے بغیر، اور کبھی کبھی تعمیراتی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، اور سرکاری زمینوں پر، مسجدیں اور مزار تعمیر کیئے۔

مذہبی آزادی کی خلاف ورزیاں

اطلاعات کے مطابق پولیس نے زیرِ حراست افراد کو اذیتیں دیں اور ان کے ساتھ بد سلوکی کی، اور کبھی کبھی ماورائے عدالت قتل میں ملوث ہوئی۔ عموماً یہ تعین کرنا نا ممکن تھا کہ ایسے کیسوں میں جن میں زیادتی کا شکار ہونے والوں کا تعلق مذہبی اقلیتوں سے تھا، مخصوص مذہبی عقائد کی وجہ سے اس قسم کا سلوک کیا گیا یا نہیں۔ تا ہم، عیسائیوں اور احمدیوں دونوں نے دعویٰ کیا کہ ان کے ارکان پر زیادتیوں کا امکان زیادہ تھا۔ غیر مسلم قیدیوں کو عموماً مسلمان قیدیوں کے مقابلے میں خراب سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ا ن میں روحانی وسائل تک رسائی کا فقدان شامل ہے ۔ معاشرے کے غیض و غضب سے بچنے کے لیئے، دوسرے اقلیتی مذہبی گروپوں میں شمولیت کے لیئے مذہب کی تبدیلی عموماً خفیہ طریقے سے عمل میں آئی۔

احمدیہ لیڈروں نے دعویٰ کیا کہ حکومت نے مذہبی وجوہات کی بنا پر، ان کے ارکان کے خلاف فوجداری قانون کی شقیں استعمال کیں۔ حکام نے اکثر تبدیلیٔ مذہب کے ذریعے احمدیہ کمیونٹی میں شامل ہونے والوں پر توہینِ مذہب، احمدیوں کے خلاف قوانین کی خلاف ورزی، یا دوسرے جرائم کے الزام عائد کیئے ۔حکومت نے احمدیوں کو نشانہ بنانے اور انہیں پریشان کرنے کے لیئے احمدیوں کے خلاف قوانین استعمال کیئے ۔ قانون کی اس شق کی مبہم زبان کی وجہ سے جس کے تحت احمدیوں کو خود کو بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر مسلمان کہنے کی ممانعت ہے، حکام کے لیئے یہ ممکن ہوا کہ وہ مسلمانوں کے روایتی خیر مقدمی الفاظ استعمال کرنے یا اپنے بچوں کو محمد کا نام دینے کی بنا پر، احمدیوں کے خلاف الزامات عائد کریں۔ ربوہ میں قائم جماعتِ احمدیہ کے مطابق، اپریل 2009 ءتک 88 احمدیوں پر مذہبی قوانین کے تحت یا ان کے مذہبی عقائد کی بنا پر، فوجداری مقدمات قائم کیے جا چکے تھے۔ ان میں سے 18 مقدمے توہینِ مذہب کے قوانین کے تحت، 68 احمدیوں کے بارے میں مخصوص قوانین کے تحت، اور دو دوسری شقوں کے تحت قائم کیئے گئے تھے۔

احمدیہ لیڈروں کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق، زیرِ نظر مدت کے آخر میں، 12 احمدی جیل میں تھے۔ ان میں سے ایک کو عمر قید اور تین کو سزائے موت کا سامنا تھا۔ پانچ کو توہینِ مذہب کے الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا تھا، اور تین مقدمہ چلائے جانے کے منتظر تھے۔ بیشتر گرفتاریاں ربوہ، کوٹلی، ننکانہ صاحب، کوٹری، اور سرگودھا میں ہوئیں۔ احمدیہ کمیونٹی کا دعویٰ تھا کہ یہ گرفتاریاں بے بنیاد تھیں اور قیدیوں کے مذہبی عقائد کی بنا پر عمل میں آئی تھیں۔ زیرِ نظر مدت میں، قتل سے لے کر املاک کی تباہی تک، احمدیہ کمیونٹی کے ممتاز افراد کے خلاف بہت سے فوجداری مقدمے درج کرائے گئے تھے۔ ان کیسوں پر استغاثے نے کارروائی نہیں کی، اور ملزمان کو ضمانت کرانے کی اجازت دے دی گئی۔

30 جون، 2009 ءکو ہاتھا پائی کا ایک واقعہ توہینِ مذہب کی مبینہ واردات میں تبدیل ہو گیا جس کے نتیجے میں پنجاب کے ضلع قصور میں ایک ہجوم نے ایک عیسائی آبادی پر حملہ کر دیا۔ اس واردات کے بعد، 700 افراد کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ وفاقی وزیر برائے اقلیتی امور، شہباز بھٹی نے متاثرہ خاندانوں کو مالی معاوضہ پیش کیا۔ کئی غیر سرکاری تنظیموں کو اس واقعے کے بارے میں تشویش رہی۔

23 جون ، 2009 ءکو کمپس ڈائریکٹ نیوز نے اطلاع دی کہ پولیس نے گجرانوالہ کے ایک عیسائی ، ارشد مسیح کو سیالکوٹ کی جیل میں قید کر دیا، اور حراست کے دوران اس پر زیادتی کی گئی ۔اطلاع کے مطابق، پولیس نے مسیح پر اس لیئے زیادتی کی کیوں کہ اس کا باپ عیسائی مبلغ ہے ۔ اگر چہ سرکاری طور پر اس پر چوری کا الزام عائد کیا گیا، لیکن بعد میں اس گواہی پر کہ وہ چوروں میں شامل نہیں تھا، اس کی ضمانت منظور کر لی گئی۔ حراست کے دوران اس پر جو جسمانی زیادتی کی گئی، اس کی وجہ سے اسے علامہ اقبال میموریل ہسپتال بھیجا گیا۔ کمپس ڈائریکٹ نیوز کے مطابق، حکام نے مبینہ طور پر اس کو حکم دیا کہ وہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کے بارے میں خاموش رہے۔

28 مئی، 2009 ءکو فیصل آباد کا ایک احمدی تاجر ،لئیق احمد، دو نامعلوم حملہ آوروں کے وحشیانہ حملے کے نتیجے میں ہلاک ہو گیا ۔ جماعت احمدیہ کے مطابق وہ ،1984 ءمیں

احمدیوں کے خلاف قوانین کے نفاذ کے بعد سے قتل ہونے والا 101 واں اور 2009 ءمیں قتل کیا جانے والا پانچواں احمدی تھا۔

مئی، 2009 ءکو چکوال، پنجاب کی ایک مذہبی درسگا ہ کے دو طالب علم، ایک احمدی، مبشر احمد کے گھر میں داخل ہوئے اور اس کا سر قلم کرنے کی کوشش کی۔ ہمسایوں نے مداخلت کی اور اس کی جان بچا لی لیکن وہ شدید زخمی ہو گیا۔ ایک طالب علم کو پکڑ لیا گیا اور مقامی پولیس اسٹیشن میں لایا گیا جب کہ دوسرا فرار ہو گیا۔ پولیس نے کیس درج کر لیا اور دوسرے حملہ آور طالب علم کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

17 اپریل، 2009 ءکو حکام نے جیل سے دو کیتھولک عیسائیوں، جیمز مسیح اور بوٹا مسیح کو رہا کر دیا ۔ انہیں توہینِ مذہب کے جرم کا مرتکب پایا گیا تھا اور نومبر 2006 ءمیں مبینہ طور پر قرآن جلانے کے جرم میں 10 سال قید کی سزا دی گئی تھی۔

4 مارچ ، 2009 ءکو ، پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 298c کے تحت 15 احمدیوں پر اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہنے ، اور وہاں نمازِ عید ادا کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ ان پر خود کو مسلمان ظاہر کرنے کا الزام بھی لگایا گیا۔ اطلاعات کے مطابق، یہ گرفتاریاں ایک کاروباری تنازعے کا نتیجہ تھیں۔

ایک 17 سالہ طالب علم، نوید عزیز ، اور پادری شفیق مسیح پر جنوری 2009 ءمیں توہینِ مذہب کا الزام عائد کیا گیا، جب عزیز کے ایک ساتھی طالب علم نے اس کے بیگ میں ایسی چیزیں دیکھیں جو توہینِ مذہب کے زمرے میں آتی تھیں۔

جنوری 2009 ءمیں پولیس نے چار احمدی لڑکوں اور ایک بالغ فرد کو لیّہ ، پنجاب میں، توہینِ مذہب کے الزامات میں گرفتار کیا۔ کیوں کہ اس الزام کی تائید میں کوئی ثبوت موجود نہیں تھا، اس لیے ملزموں پر فردِ جرم عائد نہیں کی گئی۔ تا ہم، اپنی گرفتار ی کے پانچ ماہ بعد بھی وہ جیل میں ہیں۔ اس واقعے کےبعد اطلاع کے مطابق بعض مقامی مذہبی شخصیتوں نے فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دینے کی کوشش کی ۔ مبینہ طور پر، پاکستان مسلم لیگ ،نواز پارٹی سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کے مقامی رکن، ثقلین شاہ نے ہنگامہ آرائی کے لیئے سیاسی مدد فراہم کی۔ وفاقی سطح پر، اقلیتی امور کی وزارت نے ان لڑکوں کی رہائی کی کوشش کی، لیکن زیرِ نظر مدت کے اختتام تک، اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

جنوری 2009 ءمیں پولیس نے ہیکٹر علیم کو راولپنڈی میں اپنے سیل فون سے ایسا میسیج بھیجنے کے الزام میں گرفتار کیا جو توہینِ مذہب کے زمرے میں آتا ہے ۔ انسدادِ دہشت گردی کی عدالت میں سماعت کے بعد، علیم کو ،جو ایسی ایک ایجنسی کا رکن ہے جو عیسائیوں کے حقوق کے لیئے کام کرتی ہے، توہینِ عدالت کے جرم سے بری کر دیا گیا، لیکن اس پر جرم کے ارتکاب میں حوصلہ افزائی کا الزام باقی رہا۔ ایک سرکاری عہدے دار نے کمپس ڈائریکٹ نیوز کو بتایا کہ یہ فیصلہ مذہبی انتہا پسندوں کے زیرِ اثر آکر دیا گیاتھا جنھوں نے جج سے کہا تھا کہ " اگرآپ نے علیم کو رہا کیا، تو ہم اسے باہر ہلاک کر دیں گے۔"

جنوری 2009 ءمیں ایک احمدی دوکاندار، سعید احمد کو کوٹری، صوبہ سندھ میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔احمدیہ کمیونٹی کی پریس ریلیز میں ایک ترجمان نے یہ دعویٰ کیا کہ احمد کو اس کے مذہب کی وجہ سے ہلاک کیا گیا۔

ستمبر 2008ء میں حکام نے فوجداری قانون کی ان شقو ں کے تحت جو احمدیوں کے لیئے مخصوص ہیں، 10 احمدیوں کو گرفتار کر لیا۔ 11 اکتوبر، 2008 ءکو آٹھ مزید احمدی گرفتار کر لیئے گئے۔ انکی گرفتاری کے لیئے بھی وہی کیس نمبر اور قانون کی وہی شقیں استعمال کی گئیں۔پنجاب کی صوبائی حکومت نے، مسلمانوں کے مذہبی لیڈروں کو 7 ستمبر، 2008 ءکو ربوہ میں ایک احمدی مخالف کانفرنس منعقد کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ تاریخ اس آئینی ترمیم کی برسی کی ہے جس کے تحت احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔

2008 ءمیں ، انسداد دہشت گردی کی عدالت نے پانچ افراد کو رہا کر دیا جنہیں 2005 میں منڈی بہاؤالدین، پنجاب میں، احمدی عبادت گزاروں پر حملہ کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس حملے میں آٹھ افراد ہلاک اور 20 زخمی ہوئے تھے۔

مارچ 2008ء میں ، پولیس نے کبیر والا میں احمدی الطاف حسین کو قرآن کی بے حرمتی کرنے کے الزام میں گرفتار کیا۔ الطاف حسین کو جولائی 2008ء میں خانیوال، پنجاب کی ایک ضلعی عدالت نے رہا کر دیا۔

وزیر آباد ،پنجاب کے ایک احمدی شخص کے بارے میں کوئی تازہ اطلاع دستیاب نہیں تھی جسے احمدیوں کے بارے میں پمفلٹس کی تقسیم کے الزامات میں جنوری 2008ء میں گرفتار کیا گیا تھا ۔ اسے مارچ 2008ء میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا اورموت کی کئی دھمکیاں ملنے کے بعد وہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوگیا ۔

جنوری 2008ء میں ننکانہ صاحب پنجاب کی پولیس نے ایک احمدی تاجر منظوراحمد پرایسے صفحات کو نقصان پہنچانے کا الزام عائد کیا جن میں مذہبی نوعیت کا مواد شامل تھا۔ زیر نظر رپورٹ کی تکمیل تک وہ متبرک مواد کو نقصان پہنچانے کے الزام میں جیل میں ہی تھا۔

ستمبر 2007ء میں پولیس نے ایک احمدی شخص ممتاز علی پر مقامی احمدیہ کمیونٹی کے ایک نیوزلیٹر کے لیے چندہ دینے، اسےوصول کرنے اور بعد میں اس کی تقسیم کرنے کے الزام عائد کیئے۔ اسے دس دن تک پولیس کی حراست میں رکھا گیا اور پھر اس کے بڑھاپے کے پیش نظر اسے رہا کردیا گیا۔ اکتوبر 2007ء میں اس کا انتقال ہوگیا، لیکن پولیس نے اس پر عائد الزامات ختم کرنے سے انکار کردیا اور اس کے خاندان کو نیوزلیٹر کی وصولی جاری رکھنے کی صورت میں جیل کی دھمکی دی۔ اس کا خاندان راجن پور ،پنجاب کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں منتقل ہو چکا ہے۔

نومبر 2007 ء میں تین احمدیوں کو پنجاب کے شہر سرگودھا سے اس وقت مذہب تبدیل کرانے کے الزامات میں گرفتار کیا گیا جب انہوں نے دوسرے مقامی لوگوں کو اپنی عبادت گاہوں میں آنے کی دعوت دی تھی۔ انہیں فروری 2008 ءکے وسط میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا ۔زیر نظر رپورٹ کی تکمیل تک اس کیس کے بارے میں کوئی نئی معلومات دستیاب نہیں تھیں۔

دسمبر 2007ء میں لاڑکانہ پولیس نے 21 احمدیوں کو مسلمانوں کے انداز میں اجتماع اور عبادت کرنے کے الزامات میں گرفتار کیا جب پڑوسیوں نے پولیس کو بتایا کہ انہوں نے ایک احمدی کے گھر سے اسلامی آیات کی تلاوت سنی ہے۔زیر نظر رپورٹ کے مکمل ہونے تک تمام متعلقہ افراد رہا کردیے گئے تھے۔

حکام نے مذہبی اقلیتوں اور ایسے مسلمانوں کو تنگ کرنے کے لیئے جن کی کسی کمزوری کا انہیں علم ہو، اور ذاتی دشمنیوں کا حساب چکانےیا کاروباری رقابتوں سے نمٹنے کے لیے توہین مذہب کے قوانین کا باقاعدگی سے استعمال کیا ۔حکام نے لوگوں کو جھوٹے الزامات میں گرفتار کیا اور سزائیں دلوائیں۔ ججوں اور مجسٹریٹوں نے انتہاپسندوں کے ساتھ تصادم سے بچنے کے لیے اکثر اوقات مقدمات کو غیر معینہ عرصے تک جاری رکھا۔

نیشنل کمیشن آف جسٹس اینڈپیس (NCJP)کے مطابق 2008 ء میں توہین مذہب کے قوانین کے تحت درج کیے جانے والے 24 مقدمات میں کم از کم 75 افراد کو مخالفانہ کارروائی نشانہ بنایا گیا۔ پنجاب میں توہین مذہب کے الزامات اور اس سلسلے میں درج ہونے والے مقدمات کی تعداد سب سے زیادہ رہی جو کل مقدمات کا 67 فی صد تھی، سندھ میں اس حوالے سے 21 فی صد واقعات درج ہوئے۔ ان 75 افراد میں سے 26 مسلمان ، چھ عیسائی اور دو ہندو تھے۔ احمدیوں کی تعداد کے بارے میں کوئی معلومات نہیں مل سکیں۔ 2008 ء میں احمدیوں پر لگائے جانے والے الزامات کے علاوہ، پولیس نے جون 2008 ء میں ربوہ اور کوٹلی کی پوری آبادیوں پر خلافت کے سوسال مکمل ہونے کی خوشی منانے اور کمیونٹی کے لیے ایک مسجد تعمیر کرنے پر توہین مذہب کا الزام عائد کیا۔NCJP نے کہا کہ '' عمومی طورپر ہم سیکیورٹی کی وجہ سے ضمانت کی درخواست نہیں دیتے۔ توہین مذہب کے مشتبہ افراد اکثر پولیس کی حفاظت میں ہی جیل کے اندر سب سے زیادہ محفوظ ہوتے ہیں''۔

18 جون 2008 ء کو محمد شفیق لطیف کو مبینہ طورپر قرآن کریم کی بے حرمتی اور پیغمبر اسلام کے بارے میں اہانت آمیز زبان استعمال کرنے پر توہین مذہب کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی ۔شفیق کو 2006ء میں گرفتار کیا گیا تھا ۔ وہ پنجاب کےشہر سیالکوٹ کی جیل میں رہا۔

جون 2008 ء میں چھ احمدیوں کو سندھ کے شہر کوٹری میں گرفتار کیا گیا اور ان پر توہین مذہب کے الزامات لگائے گئے۔یہ گرفتاریاں احمدیوں کی ایک عبادت گاہ کی تعمیر پر ایک تنازع اور احمدیہ مذہب کے خلاف مذہبی علما کی ایک تنظیم' تحفظ ختم نبوت' کے ملاؤں کے مظاہروں کے بعد عمل میں آئیں۔

کمپس ڈائریکٹ نیوز کے مطابق مئی 2008ء میں پولیس نے ایک عیسائی، رابن سردار کو گرفتار کر لیا ۔ یہ اس وقت ہوا جب پنجاب میں ایک ہجوم نے اس کےگھر پر حملہ کیا اور الزام لگا یا کہ اس نے مبینہ طور پر توہین مذہب کا ارتکاب کیا ہے۔سردار کو، جس نے ان الزامات سے انکار کیا ، پنجاب کے شہر گوجرانولہ کی سینٹرل جیل میں رکھا گیا۔ اس کی بیوی اور چھ بچے مزید حملوں کے ڈر سے اپنا گھر چھوڑ کرچلے گئے۔اطلاعات کے مطابق مقامی اسلام پرست تنظیموں نے سردار کے بری کیے جانے کی صورت میں اسےجان سے مار نے

کی دھمکی دی تھی ۔ سردار کو چار نومبر 2008ء کو اس وقت رہا کردیا گیا جب الزام لگانے والے شخص نے کہا کہ اسے غلط فہمی ہوئی تھی ۔

مئی 2008 ء میں، مسلمانوں نے پادری فرینک جان کے خلاف توہین مذہب کا ایک مقدمہ اس وقت درج کرایا جب وہ گرین ٹاؤن کرسیچن کالونی لاہور ،پنجاب میں ایک مذہبی کنونشن کی قیادت کررہے تھے۔ جب عیسائی کنونشن کے لیے اکٹھے ہوئے تو مقامی مسلمانوں نے کہا کہ کسی کو بھی عبادت کے لیے لاؤڈ اسپیکر زکے استعمال کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ پولیس نے تین نومبر 2008 ءکو پادری کے خلاف فرسٹ انفرمیشن رپورٹ (FIR)درج کی۔ پادری جان کو گرفتار نہیں کیا گیا اگرچہ عیسائیوں اور مسلمان کمیونیٹیز میں کشیدگی جاری رہی ۔

اپریل 2008 ءمیں کراچی کے صنعتی علاقے کورنگی کی ایک فیکٹری کے ملازموں نے ایک ہندو ملا زم جگدیش کمار کو مبینہ طور پر اسلام کے خلاف توہین آمیز کلمات اد ا کرنے پر مار مار کر ہلاک کر دیا۔فیکٹری کے محافظوں نے جگدیش کو حفاظتی حصار میں لے کر بچانے کی کوشش کی اور پولیس کے ایک چھوٹے دستے کو بلایا گیا ۔ بعد میں کراچی پولیس کےسپرنٹنڈنٹ نے یہ تعین ہونے کے بعد کہ انہوں نے جگدیش کی جان بچانے کےلیے مناسب اقدامات نہیں کیے تھے پولیس اہلکاروں کو معطل کر دیا ۔

زیر نظر رپورٹ کی تکمیل تک پنجاب کے شہر بوریوالہ کے ایک رہائشی عبد المالک کے خلاف ستمبر 2007 ءمیں پیغمبر اسلام کے خلاف اہانت آمیز کلمات کہنے کی بناء پر ایک مقدمہ درج کیا جا چکا تھا لیکن اسے گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ اسلامی تنظیموں نے عبدا لمالک کی گرفتاری اور توہین مذہب کے مبینہ ارتکاب پر اسے سزا دینے کا مطالبہ کرتے ہوئے لاہور بھر میں کئی مظاہرے کیے۔

ایک عیسائی ،یونس مسیح کو اس بناءپر توہین مذہب کے الزامات میں سزائے موت سنائی گئی کہ اس نے رات کے وقت کی ایک مذہبی تقریب میں اونچی آواز میں موسیقی بجانےپر ایک مسلمان عالم دین کے ساتھ ہونے والے ایک تنازع کے دوران پیغمبر اسلام کی مبینہ طور پر توہین کی تھی ۔ مسیح کو لاہور کی ایک ضلعی عدالت نے مئی 2007ء میں سزائے موت سنائی تھی ۔زیر نظر رپورٹ کی تکمیل تک اس فیصلے کے خلاف اپیل کی جا چکی تھی۔

زیر نظر رپورٹ کے اختتام تک ایک کیتھولک عیسائی ، ستار مسیح، جسے 2007 ءمیں پیغمبر اسلام کے خلاف مبینہ طور پر اہانت آمیز کلمات لکھنے کی بنا پر ایک ہجوم نے زدو کوب اور پولیس نے گرفتار کیا تھا ،مسلسل جیل میں تھا ۔ پولیس نے حراست کے دوران اقبال جرم کروانے کے لیےا سے مبینہ طور پر اذیت کا نشانہ بنایا تھا ۔

زیر نظر رپورٹ کے اختتام تک سلامت مسیح جیل میں تھا اور اس کا خاندان اس کے بعد سے روپوش تھا، جب سے عہدے داروں نےاس پر اور اس کے خاندان کے چار افراد پر ، جو سبھی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے عیسائی تھے ، 2007 ءمیں ایسے صفحات کی بے حرمتی کا الزام عائد کیا جن میں پیغمبر اسلام کا نام موجود تھا۔

مارچ 2007 میں مسلمانوں کےایک ہجوم نے ایک عیسائی امانت مسیح پر مبینہ طور پر قران کی بے حرمتی کرنے کی بناء پر حملہ کیا ۔ پولیس نے مسیح کو توہین مذہب کے الزام میں گرفتار کیا ۔ زیر نظر رپورٹ کی تکمیل تک وہ مسلسل قید میں تھا۔

ستمبر 2006 میں پولیس نے ایک احمدیہ اشاعتی ادارے ' *الفضل* ' کے لیے کام کرنے والے پانچ احمدیوں کو توہین مذہب کے الزامات میں گرفتار کیا۔ جماعت احمدیہ کے مطابق ان تمام کو رہا کر دیا گیا تھا لیکن پولیس نے انہیں سختی سے انتباہ کیا کہ وہ اشاعت کا سلسلہ بند کر دیں ۔ اس واقعے کے بعد صوبائی اور ضلعی حکومتوں پر تمام پنجابی احمدیوں کی اشاعتی سر گرمیاں بند کروانے کے لیے دباؤ ڈالا گیا ۔

جولائی 2006ء میں عدالتوں نے حافظ افضل رحمان اور حاجی لطیف کو ضمانت پر رہا کر دیا جو توہین مذہب کے الزامات میں 2004 ءسے لاہور کی جیل میں قید تھے۔ زیر نظر رپورٹ کے اختتام تک ان کے مقدمات التوا میں تھےاوروہ دونوں ضمانت پر رہا تھے۔ جب کہ زیر نظر مدت کے اختتام تک سماعت کے لیے کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی تھی۔

اقلیتی کمیونٹیز کا دعویٰ تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی املاک پر قبضوں میں حکومت کی ساز باز شامل تھی اور یہ کہ کچی آبادیاں گرانے کی پالیسی میں اقلیتی کمیونٹیز کو غیر متناسب طریقے سے ہدف بنایا گیا تھا۔ ان اقلیتی گروپوں نےاپنےعبادات کے مقامات پر انتہاپسندوں کے حملوں کے واقعات کےضمن میں حکومت پرکوئی کارروائی نہ کرنے کا الزام بھی لگایا۔

جولائی 2007 ءمیں مبینہ طورپر گرفتار کرکے زبردستی چین واپس بھیجے جانے والے ایک ایغور مسلمان کے کیس کے بارے میں کوئی تازہ معلومات دستیاب نہیں تھیں ۔ اس بارے میں بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ مذکورہ شخص کو اس کے مذہبی عقائد کی بنا پرگرفتار کیا گیا تھا۔ اس حوالے سے مستند اطلاعات موجود تھیں کہ چینی حکومت زبردستی واپس بھیجے جانے والے ایغور مسلمانوں کو اذیتیں دی ہیں اور موت کی سزا دی ہے۔

حکومت نے مذہبی عقائد کی بنا پر کسی سے جبری محنت نہیں لی اور نہ کسی کو غلام بنایا؛ تاہم اقلیتی کمیونٹی کے راہنماؤں کا الزا م تھا کہ حکومت اینٹوں کے بھٹوں اور زرعی شعبوں میں قرض یا رہن پر مبنی مشقت کو روکنے کے لیے مناسب اقدام کرنے میں ناکام رہی ۔ عیسائی اور ہندو اپنی آبادی کے لحاظ سے غیر متناسب تعداد میں اس غیر قانونی رواج کا نشانہ بنے۔

جبری تبدیلیِ مذہب

ایسے واقعات بھی سامنے آئے کہ سماجی شخصیات کے ہاتھوں مذہبی اقلیتوں کے ارکان جبراوردباؤ کے تحت اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوگئے۔ مذہبی اقلتیوں کا دعویٰ تھا کہ اس مسئلے کی روک تھام کے لیے حکومتی اقدامات ناکافی تھے۔ سندھ میں ہندو کمیونٹی کے نمائندوں کا دعویٰ تھا کہ ہر سال 15 سے 20 ہندو خاندانوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا(عام طورپر خاندانی قرضوں سے منسلک حالات کی بناء پر)۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں مقامی شخصیات کی ہاتھوں نوجوان ہندو خواتین کے اغوا کے بڑھتے ہوئے واقعات کو

نمایاں کرتی رہیں،جنہیں زبردستی اسلام قبول کرنے اورپھر اپنے اغوا کاروں کے ساتھ شادی پر مجبور کیا گیاتھا ، خاص طورپرکراچی اور سندھ کے دوسرے حصوں میں۔

ستمبر 2007 ءمیں محمد رمضان نے ملتان کی ایک عیسائی خاتون طاہرہ سلامت کو اغوا کیا اور اسے اسلام قبول کرنے اور پھرخود سے شادی پر مجبور کیا۔ زیر نظر رپورٹ کی تکمیل تک سلامت، رمضان کے ساتھ رہ رہی تھی اور لاہور ہائی کورٹ نے رمضان کے خلاف ابتدائی مقدمہ ختم کردیا تھا۔NCJP کے مطابق یہ مقدمہ ، سلامت کی جانب سے یہ تحریری بیان عدالت میں داخل کرانے کےبعدواپس لے لیا گیا تھا کہ اس نے اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کیا ہے اور وہ کسی دباؤ کے بغیر اپنے شوہر کے ساتھ رہ رہی ہے۔

اپریل 2009 ء میں سندھ اسمبلی میں اقلیتی طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک وزیر نے دعویٰ کیا کہ 18 ہندو خواتین کو اغوا کیا گیا اور انہیں زبردستی مسلمان بنایا گیا اور یہ کہ ان میں سے ایک کو مبینہ طور ہلاک کردیا گیا ۔

این سی جے پی کے مطابق جبری تبدیلیِ مذہب اور اغوا کے کئی واقعات صوبہ پنجاب کے علاقوں فیصل آباد، لاہور اور گوجرانوالہ میں رپورٹ کیے گئے۔ این سی جے پی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 2008ء میں جن 39 خواتین کو اغواکے بعد اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیاتھا، ان میں سے34 واقعات صرف لاہور میں پیش آئے۔ ان خواتین کی اکثریت عیسائی تھی اور ان میں سے دو ہندو تھیں ۔

29 مارچ 2009ء کو صوبہ پنجاب کے علاقے سائیں والا میں ایک عیسائی خاتون ثنا کو اغوا کیا گیا، اس کی آبروریزی کی گئی اور اس سے جبراً اسلام قبول کروایا گیا۔

ان نابالغ افراد امریکی شہریوں کے بارے میں جبری تبدیلیِ مذہب کی کوئی اطلاعات موجود نہیں تھیں ، جنہیں امریکہ سے اغوا یا غیر قانونی طورپر لے جایا گیا تھا یا جنہیں امریکہ واپسی کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

باغیوں یا غیر ملکی فورسز یا دہشت گرد تنظیموں کی جانب سےبد سلوکیوں کے واقعات

ایسے افراد یا ایسی تنظیموں کے ہاتھوں جنہیں امریکی وزیر خارجہ نے امیگریشن اور شہریت کے قانون کی دفعہ 219 کے تحت دہشت گرد قرار دیاتھااور ان تنظیموں سے گہرے روابط رکھنے والے مسلح فرقہ پرست انتہاپسند گروپوں کے ہاتھوں ، مذہبی گروپوں کی بدسلوکی کےکئی واقعات پیش آئے۔

زیر نظر رپورٹ کی تیاری کے دوران، ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ تشددجاری رہا، خاص طورپر ڈیرہ اسماعیل خان، کوئٹہ، ٹانک ، ڈی جی خان ، گلگت اور کرم ایجنسی میں شیعہ اقلیت پر حملے کیے گئے۔

زیر نظر رپورٹ کی تیاری کے پورے عرصے کے دوران ملک بھر میں ، خاص طورپر شمال مغربی سرحدی صوبے میں اسلام پرست انتہاپسندوں کے حملوں ، دھمکیوں اور تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوا۔

مالاکنڈ اور وادی سوات کے علاقے میں جاری فوجی کارروائیوں کے سلسلے میں 300 سے زیادہ سکہ خاندان وہاں سے چلے گئے۔بے گھر ہونے والے بیشتر خاندانوں نے حسن ابدال میں گردوارہ پنجہ صاحب میں پناہ لی۔ سوات میں تقریباً 6000 سکہ آباد ہیں جو بد امنی کا شکار اس وادی میں (عیسائیوں کے بعد) وہاں کی دوسری سب سے بڑی اقلیت ہیں۔

مذہبی علما کو ہدف بنا کر قتل کرنا کئی تنظیموں کا ایک اہم حربہ رہا ، جن میں کالعدم فرقہ پرست تنظیم سپاہ صحابہ(SSP)دہشت گرد تنظیم لشکر جھنگوی(LJ)،اور فرقہ پرست تنظیمیں سنی تحریک (ST)،اور سپاہ محمد پاکستان(SMP)شامل ہیں۔ SSP اور LJنے شیعوں اور بریلویوں، دونوں کواپنا ہدف بنایا جب کہ دیوبندی STاور SMP کا ہدف بنے رہے۔

زیر نظررپورٹ کی تیاری کے پورے عرصے میں صوبہ سرحد اور فاٹا میں حجاموں کی دکانوں اور میوزک کی سی ڈی اور کیسٹ فروخت کرنے والی دکانوں پر اسلام پرست عسکریت پسندوں کے حملوں کے بارے میں متعدد رپورٹیں سامنے آئیں۔

LJنے اس رپورٹ کی تیاری کے پورے عرصے میں عبادت گاہوں اور مذہبی اجتماعات پر حملے جاری رکھے۔

القاعدہ سے منسلک تنظیموں نے ملک میں نیٹ ورک برقرار رکھے اور ان کے حامیوں نے گاہے گاہے یہودمخالف بیانات جاری کیے۔

12 جون 2009ء کو ایک خودکش بمبار نے نوشہرہ کی ایک مسجد پر نماز جمعہ کے دوران حملہ کیا اور 10 افراد کو ہلاک اور ایک سو کو زخمی کردیا۔ اسی روز لاہور کی جامعہ نعیمیہ میں ایک خودکش بم دھماکے میں ڈاکٹر مفتی سرفراز نعیمی اور پانچ دوسرے افراد ہلاک اور سات زخمی ہوئے۔ اس عالم دین کی ہلاکت کے ضمن میں ملنے والی خبروں کے مطابق نعیمی کے پیروکاروں کا خیال تھا کہ انہیں طالبان کے خلاف ، جن کی وہ کھلم کھلا مخالفت کرتے تھے ،فوجی کارروائیوں کی پُر جوش حمایت کرنے پر ہدف بنایا گیا تھا ۔

پانچ جون 2009ء کو بالا دیر کی ایک مسجد پر ایک خودکش حملے میں 42 افراد ہلاک اور 70 زخمی ہوئے۔

دو جون 2009 ء کو لشکر اسلام نے سکھوں ، ہندوؤں اور عیسائیوں پر سالانہ لگ بھگ 12 ڈالر (ایک ہزار روپے)ٹیکس عائد کردیا۔

15 اپریل 2009ء کو لال مسجد کے راہنما عبدالرشید غازی اور 2007ء میں عسکریت پسندوں اور فوج کے درمیان محاذ آرائی کے دور کے امام مسجد کے بھائی ،مولانا عزیز، کو سپریم کورٹ نے ضمانت پر رہا کردیا۔ مولانا عزیز کو دہشت گردوں کی معاونت سے لے کر ایک عمارت پر ناجائز قبضے تک کے 27 الزامات پر مقدمات کا سامنا تھا۔دو مئی 2009ء کو میڈیا

نے خبردی کہ کیپیٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی (CDA)نےاسلام آباد میں جامعہ حفصہ کی درس گاہ کی تعمیر نو کے لیے، جسے 2007 ء میں فوجی کارروائی کے دوران منہدم کردیا گیاتھا، اسلام آباد میں 12 ایکڑ زمین الاٹ کردی ہے۔ جولائی 2007ء میں اسلام آباد کی لال مسجد، فوج اور مسجد کے اندر موجود عسکریت پسندوں کے درمیان خون ریز محاذ آرائی کا مرکز بن گئی تھی۔ مسجد کے راہنماؤں اور ملحقہ درس گاہوں میں ہزاروں طلبہ اور طالبات نے اسلامی شریعت کے نفاذ کو اپنا ایک اہم نصب العین قرار دیا اور ایک اسکول کی لائبریری پر قبضہ کرلیا۔انہوں نے کئی سلسلہ وار غیر قانونی سرگرمیوں کے ذریعے 'غیر اسلامی' حکومت کی حاکمیت کو چیلنج کیا اور حکام کے خلاف جہاد کی اپیل کی ۔ عسکریت پسندوں نے قحبہ خانوں کے مالکان ، پولیس اہل کاروں ، مساج پارلرز کے غیر ملکی کارکنوں کو اغوا کیا اور اسلامی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا۔ لڑائی اس وقت چھڑگئی جب عسکریت پسندوں نےمسجد کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے والی سیکیورٹی فورسز پر فائرنگ کی جس سے سیکیورٹی کے 10 اہل کار اور لگ بھگ 79 عسکریت ہلاک ہوئے جن میں مسجد کے امام عبدالرشید غازی شامل تھے۔ فوجی آپریشن کے نتیجے میں حکومت کو ملک بھر کے مدرسوں میں انتہا پسندی کاپرچار ختم کرانے کی اپنی کوششیں پھر سے شروع کرنا پڑیں۔ سپریم کورٹ نے اکتوبر 2007ء کو مسجد دوبارہ کھولنے کے ساتھ ساتھ مدرسے کی تعمیر نو کا بھی حکم دیا۔

اپریل 2009ء میں طالبان نے اورکزئی ایجنسی، فاٹا میں جزیہ ٹیکس کے نام پر،(روائتی طورپر غیرمسلموں سے ان کے تحفظ کے عوض لگایا جانے والا سرکاری ٹیکس) رقم کی زبردستی وصولی شروع کردی۔ ٹیکس کی جبری وصولی اور حملوں کے باعث سکھ کمیونٹی کے کچھ ارکان، لگ بھگ دولاکھ چالیس ہزار ڈالر(دوکروڑ روپے) جزیے کے طور پر ادا کر چکنے کے بعد اس وقت علاقہ چھوڑ کرچلے گئے جب طالبان نے ان کے گھروں پر زبردستی قبضہ اور ایک سکھ راہنما کلیان سنگھ کو اغوا کر لیا ۔

22 اپریل 2009ء کو کراچی ، سندھ کے ایک عیسائی علاقے، تیسر ٹاؤن ،میں ایک گرجا گھر کی دیواروں پر یہ دھمکی آمیز پوسٹر چسپاں کیے جانے کے بعد کہ عیسائی یاتو مذہب تبدیل کریں یا جزیہ دیں، ایک ہجوم نے وہاں حملہ کیا۔اس حملے میں ایک شخص عرفان مسیح ہلاک اور تین زخمی ہوئے اور عیسائیوں کے کئی گھروں ، دکانوں اور تین گرجا گھروں کو تباہ کردیا گیا۔ یہ حملے کراچی میں،جہاں اقلیتی گروپس کو ماضی میں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہاتھا، بڑھتی ہوئی طالبانیت کے خدشات کے دوران ہوئے۔

11 اپریل 2009ء کو عسکریت پسندوں نے صوبہ سرحد کے علاقے بونیر میں صوفی بزرگ پیربابا کے مقبرے پر قبضہ کرکے اسے عام لوگوں کے لیے بند کردیا۔

13 مارچ 2009 ءکو کراچی کی انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے لشکر جھنگوی کے سرگرم کارکنوں کو رہا کردیا جن میں محمد عاطف، محمد ارشد، محمدآصف اور زبیر الدین شاہجیل شامل تھے ، جو 2002ء میں انصاف اور امن کی کمیٹی کے سابق ڈائریکٹر ایڈون مون سمیت ،عملے کےسات عیسائی ارکان کے قتل کا اقبال جرم کرچکے تھے۔

پانچ مارچ 2009ء کو عسکریت پسندوں نےپشاور،صوبہ سرحد کے علاقے ہزار خوانی میں رحمان بابا کے طورپر معروف،17 ویں صدی کے ایک صوفی بزرگ اور پشتو کے ایک انتہائی محترم شاعر عبدالرحمن محمد کے مزار کو دھماکے سے اڑا دیا۔ اس دھماکے میں کوئی زخمی نہیں ہوا لیکن صوفی بزرگ کی قبر اور مزار کی عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ متولیوں نے بتایا کہ انہیں حملے سے تین دن قبل مبینہ طور پر طالبان عسکریت پسندوں کی جانب سے ایک انتباہی خط ملا تھا جس میں مزار پر خواتین کی آمد جاری رہنے کی صورت میں اسے دھماکے سے اڑادینے کی دھمکی دی گئی تھی ۔

دو مارچ2009ء کو سونگو، پنجاب میں ایک Presbyterian چرچ پر ، جہاں ارکان عبادت کے لیے جمع ہو چکے تھے، ایک ہجوم نے حملہ کیا، جس کے نتیجے میں ایک عورت ہلاک اور 28 افراد زخمی ہوگئے۔

فروری 2009ء میں پنجاب میں ایک سرکاری سیکیورٹی ایجنسی نے ایک انتباہ جاری کیا کہ کہ دہشت گردوں نے صوبے میں احمدیوں کے 365 مذہبی اور کاروباری مراکز پر حملوں کی منصوبہ بندی کی ہے۔

20 فروری 2009ء کو صوبہ سرحد کے شہر ڈی آئی خان میں شیعوں کے ایک جنازے کے جلوس پر خودکش حملہ ہوا جس میں 31 سے زیادہ افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔

دسمبر2008ء میں صوبہ سرحد کے شہر کوہاٹ میں ایک کیتھولک پادری فادر سہیل پیٹرک کو دھمکی پر مبنی ایک خط اورکئی ٹیلی فون کالز موصول ہوئیں۔

7 اکتوبر 2008 کو صوبہ سرحد کے علاقے سوات میں مقامی طالبان نے سری لنکا کی پاپائے روم کے سلسلے کی راہباؤں کے زیر انتظام چلنے والے لڑکیوں کے کانونٹ اسکول کو دھماکے سے اڑادیا۔ میڈیا کے مطابق اسکول کی عمارت تباہ ہوگئی ۔ کوئی جانی نقصان اس لیے نہیں ہواکہ سکول اور کانونٹ کو چند دن پہلے بند کرکے خالی کردیا گیاتھا۔

اکتوبر 2008ء کو صوبہ سرحد کے علاقے کوہاٹ کے جوزف ہائی سکول کو مذہبی انتہاپسندوں کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جو عیسائیت کے خلاف توہین آمیز عبارت پرمشتمل تھا۔ خط لکھنے والے نے اسکول کی انتظامیہ پر مسلمان طالب علموں اورا ساتذہ پر عیسائیت ‘مسلط’ کرنے کا الزام بھی عائد کیا تھا۔ NCJP کے مطابق جنوری 2009ء میں طالبان نے مبینہ طورپر سینٹ جوزف ہائی سکول کے ایک ہندو طالب علم کو اغوا کیا تھااور تقریباً 2 لاکھ 47 ہزار ڈالر(دو کروڑ روپے) تاوان کا مطالبہ کیا تھا۔

اکتوبر2008ء کو صوبہ سرحد کے شہر مردان میں پولیس نے ایک ہندو لڑکے اوم راج کو رہا کروایا جسے طالبان نے 26 اگست 2008ء کو اغوا کرلیاتھا۔ طالبان نے اس کی رہائی کے لیے تاوان کا مطالبہ کیا تھا لیکن بااثر مقامی تاجروں کی مداخلت کے بعد اسے رہا کردیا۔

اکتوبر2008 کو بھکر ، پنجاب میں ، قومی اسمبلی کے ایک شیعہ رکن (پاکستان مسلم لیگ ، نواز) رشید اکبر نوانی کو ہدف بنا کر کیے گئے ایک خودکش بم دھماکے میں نوانی سمیت 25

افراد ہلاک اور 62 زخمی ہوئے۔پولیس نے اس حملے کو القاعدہ اور طالبان سے رابطے رکھنے والے ایک فرقہ پرست عسکریت پسند گروپ سے منسلک کیا ۔

اگست 2008ء کو کرم ایجنسی ،فاٹا میں شیعہ اور سنی گروہوں میں فرقہ وارانہ جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ مسلسل جھڑپوں کے نتیجے میں اگست اور نومبر2008ء کے درمیان مبینہ طور پر تقریباً سات سو افرادہلاک اور ہزاروں نقل مکانی کر گئے تھے۔ 25 ستمبر 2008 ءکو اسلام آباد میں دونوں فرقوں کے ایک سو ارکان پر مشتمل ایک قبائلی جرگہ، جس میں پارلیمانی ارکان شامل تھے ، فرقہ وارنہ تشدد کے خاتمے پر متفق ہوا۔

کرم وہ واحد قبائلی ایجنسی ہے جہاں آبادی میں شیعوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ علاقے کے پانچ لاکھ مکینوں میں 42 فی صد شیعہ ہیں۔ کرم ایجنسی میں فرقہ وارانہ دشمنی تاریخی اعتبار سے گاہے گاہے تصادم کی شکل اختیار کرتی رہی ہے۔ 2008ء میں عسکریت پسندوں نے پاکستان اور افغانستان کو منسلک کرنے والی کرم ایجنسی کے اہم راستوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ان جھڑپو ں کا زیادہ سے زیادہ ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ۔

مذہبی آزادی کے احترام میں بہتری اور مثبت پیش رفت

حکومت نے زیر نظر رپورٹ کی مدت کے دوران، مذہبی آزادی کے فروغ کے لیے اقدامات کیےجن میں کرم ایجنسی ،فاٹا میں گفت و شنید اور امن مذاکرات کے ذریعے شیعہ سنی فسادات کے خاتمے کی کوششیں شامل تھیں۔

حکومت نے شہباز بھٹی کو اقلیتی امور کاوزیر اور ایک دوسرے عیسائی، جمشید رحمت اللہ ، کو لاہور ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا۔ اقلیتی گروپوں نے ان دونوں اقدامات کو مثبت علامت تصور کیا۔

نومبر2008 ء میں وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اقلیتی امور کے قومی کمیشن(NCM)کی اصلاح کی منظوری دی ، جسے قومی زندگی میں اقلیتی گروپوں کی مؤثر شرکت یقینی بنانے کے لیے اقدامات کی سفارشات تیار کرنے اور اقلیتوں کے خلاف کسی بھی قسم کی امتیازی پالیسیوں یا قوانین کے جائزے کے لیے 1993 ء میں قائم کیا گیا تھا۔انہوں نے 11 اگست کو، اس دن کی یاد میں ، جب بانی پاکستان ،محمد علی جناح ،نے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں اپنے پہلے خطاب میں تمام مذہبی گروپوں کے لیے مذہبی آزادی کا وعدہ کیاتھا، اقلیتوں کے دن کے طور پر منانے کا اعلان بھی کیا ۔

مئی 2009 ءکو حکومت نے وفاقی ملازمتوں میں اقلیتوں کے لیے پانچ فیصد کوٹے کی منظوری دی۔ اقلیتی امور کے وزیر نے اس اقدام کو ملک میں اقلیتوں کے لیے مساوات اور برابر کے مواقع کی جانب ایک سنگ میل قرار دیا۔

28 مئی 2009 کو حکومت نے اقلیتوں کے ساتھ یک جہتی کا پہلا دن منایا ، اس موقع پر ہونے والے ایک کنونشن میں وزیر اعظم نے اقلیتوں کے ایک عجائب گھر، مذاہب سے متعلق ایک لائبریری اور عبادت کے ایک مشترکہ مقام پر مشتمل ایک بین المذاہب مرکز کے قیام کااعلان کیا۔

حکومت نے اقلیتی گروپس کے دس مذہبی تہواروں کا قومی پیمانےپرانعقاد جاری رکھا۔ بہائی کمیونٹی نے اپنی مذہبی تہوار' عید رضوان ' کو تعطیل قرار دیے جانے کا خیر مقدم کیا۔

اسلام آباد میں مذاہب کی عالمی کونسل نے، اسلامی، عیسائی، ہندو، سکھ، بودھ اور پارسی کمیونٹیز کے راہنماؤں کی معاونت سے پورے ملک میں بین ا لمذاہب مذاکرات کا اہتمام جاری رکھا اور مذہبی امور کی وزارت اور اسلامی نظریاتی کونسل کی جانب سے نسبتاً چھوٹے بین المذاہب اجلاس اور مذاکراتی اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ ان اجلاسوں کے بعد دیوبندی اور جماعت اسلامی کے مذہبی اور سیاسی راہنماؤں نے عیسائیوں اور ہندوؤں کے خلاف اپنے سخت بیانات میں نمایاں طورپر کمی کی۔

جنوری 2009ء میں اڈیالہ جیل، ملک کی وہ پہلی جیل بن گئی جس کے احاطے میں ایک چرچ قائم ہوا ۔مقامی عیسائی کمیونٹی اور جیل کے لگ بھگ 250 عیسائی قیدیوں نے، اس تعمیر کی خوشی منائی۔ یہ تعمیر مقامی عیسائیوں کے عطیات سے ممکن ہوئی ۔

16 اپریل 2009 کو دو بھائیوں کو، جن پرتوہین مذہب کا الزام تھا، نارووال، پنجاب میں پولیس اور عیسائی گروپوں کے درمیان عدالت سے باہر تصفیہ طے پا جانےکے بعد جیل سے رہاکردیا گیا ۔

15 اپریل 2009 کو سندھ کے اقلیتی امور کے وزیر موہن لال کوہستانی نے ہندوکمیونٹی کے غریب، اپاہج اور معذور افراد کی مالی مدد کے لیے 12 لاکھ 30 ہزار ڈالر (دس کروڑ روپے) کے عطیے کا اعلان کیا۔ حکومتِ سندھ نے ، ہندو جم خانہ' (سپورٹس کا اسٹیڈیم) ہندوکمیونٹی کو واپس کرنے کا اعلان کیا۔

سیکشن۔ III: مذہبی آزادی کے سماجی احترام کی صورت حال

مذہبی کمیونٹیوں کے مابین تعلقات بدستور کشیدہ رہے۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف اور مسلمان فرقوں کے درمیان تشدد جاری رہا۔ بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ ان حملوں کی ذمہ دار ایک چھوٹی سی اقلیت تھی۔ تاہم امتیازی قوانین اور مذہبی عدم رواداری کے پرچارنے ایسےحملوں کے لیے ساز گار ماحول پیدا کیا ۔پولیس نے اکثر اوقات تشدد اور ہراساں کرنے کے واقعات روکنےیا ایسی کارروائیوں کے مرتکب افراد پر الزام عائد کرنےسے انکار کیا ۔

کبھی کبھار ہجوموں نے ایسے افراد اور ان کے خاندانوں یا ان کی مذہبی کمیونٹیوں پر حملے کیے جن پر توہین مذہب کا الزام لگایا گیا تھا۔ جب توہین مذہب اور دوسر ے مذہبی مقدمات عدالت میں پیش کیئے گئے تو اکثر اوقا ت عدالت کے کمروں میں انتہا پسندبڑی تعداد میں گھس آئےاور انہوں نے کسی بھی بری کئے جانے والے کےخلاف کھلے عام دھمکیاں دیں ۔ مذہبی انتہا پسندوں نے توہین مذہب کے الزامات میں بری ہونے والوں کو ہلاک کرنے کی دھمکیاں جاری رکھیں ۔ ممتاز شخصیات پر جب کبھی الزام عائدہوئے تو وہ بری ہونے کے بعد اکثر اوقات یا تو روپوش ہو گئیں یا ملک چھوڑ گئیں ۔

احمدی مذہب کے افراد اور ادارے ایک عرصے سے مذہبی تشدد کا نشانہ بنتے رہے ہیں جن میں سے بیشتر کو مذہبی انتہاپسندوں نے منظم کیا۔

احمدیہ کمیونٹی کے ایک ترجمان کے مطابق 1984 میں احمدی مخالف قوانین کے نفاذ کے بعد سے، 101 احمدی مذہبی بنیادوں پر ہلاک ہو چکے ہیں۔

صدر انجمن احمدیہ کے پریس سیکشن کے مطابق ،2008 میں قومی اردو اخباروں میں احمدیوں کے خلاف1,033 بیانات شائع ہوئے ۔ پچھلے برس کے مقابلے میں یہ تعداد 59 زیادہ ہے ۔

14 مارچ 2009 کو نامعلوم حملہ آوروں نے دو احمدی ڈاکٹروں کو،جومیاں بیوی تھے ، ملتان میں ان کی رہائش گاہ میں ہلاک کر دیا۔خبروں کے مطابق دونوں کے جسموں پر تشدد کے نشان موجود تھے اور ان کے گھر سے کوئی چیز نہیں لے جائی گئی تھی۔احمدی کمیونٹی کا دعویٰ ہے کہ ان دونوں کو مذہبی وجوہ کی بناء پر ہلاک کیا گیا تھا۔

29 اکتوبر 2008 کو صوبہ سرحد کے شہر ہری پور میں ایک شخص نے ایک احمدی ڈاکٹر ،محمد اسلم، پر اس کے کلینک میں حملہ کیا۔ رپورٹوں کے مطابق حملہ آور نے پکڑے جانے سے قبل ڈاکٹر پر چار مرتبہ چھرے سے وار کئے۔ ڈاکٹر زندہ بچ گئے۔

ستمبر 2008 کو ایک سابق وفاقی وزیر اور ایک مقبول مذہبی ٹیلی وژن شو کے میزبان نے ٹیلیویژن پروگرام کے دوران اعلان کیا کہ احمدیوں کو ہلاک کرنا دین دار مسلمانوں کا اسلامی فرض ہے۔ سندھ میں اس اعلان کے 48 گھنٹے کے اندر کم از کم دو احمدی ہلاک ہوئے ۔ آٹھ ستمبر 2008 ء کو میر پور خاص ، سندھ میں احمدیہ کمیونٹی کے ضلعی صدر ڈاکٹر عبد المنان صدیقی کو ان کے اسپتال میں ہلاک کر دیا گیا۔ انہیں دو حملہ آوروں نےاس وقت گولی مار کر ہلاک کیا جب وہ ایک مریض کو دیکھ رہے تھے۔ ہلاک ہونے والے دوسرے شخص ، احمدیہ کمیونٹی نواب شاہ کے ضلعی امیر ، سیٹھ محمد یوسف کو ایک مقامی بازار میں دن دھاڑے ہلاک کر دیا گیا ۔ ان ہلاکتوں کا سنجیدگی سے نوٹس لیتے ہوئے پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن ،(HRCP) نے اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے اور میڈیا پر نفرت کا پرچار بند کرنے کے لیے فوری اقدامات کا مطالبہ کیا ۔ زیر نظر رپورٹ کے مکمل ہونے تک حکومت ان ہلاکتوں کی تفتیش کو مسلسل ٹالتی رہی ۔

ستمبر 2008 ءکو کنری، سندھ میں انتہا پسند عناصر نے احمدیوں کے خلاف مسلسل مظاہروں اور انہیں تنگ کرنے کی ایک بھر پور مہم شروع کی جس کے نتیجے میں اشتعال انگیز جلوس نکالے گئے اور احمدیوں کے گھروں پر حملے ہوئے۔ مظاہرین نے پولیس پر احمدیوں کے خلاف توہین مذہب کے مقدمات درج کرنے پر زور دیا ۔ دو احمدیوں کو گرفتار کیا گیا اور وہ زیر نظر رپورٹ کی تکمیل تک قید تھے۔

یکم ستمبر 2008 ء کو کراچی، سندھ کی منظور کالونی میں دواؤں کی دوکان پر کام کرنے والے ایک احمدی ، شیخ سعید احمد کو مبینہ طورپر مذہبی انتہا پسندوں نے گولی مار دی ۔ وہ 13 ستمبر 2008ء کو ہلاک ہوئے۔

10 ستمبر2008ء کو ایک احمدی داؤد احمد جوئیا کو ، کلرکہار، پنجاب کے کیڈٹ کالج میں لیکچرر کے طور پر اپنی تقرری کے کئی ہفتوں بعد اس وقت برطرف کردیا گیا جب کالج انتظامیہ کو ان کے عقائدکے بارے میں علم ہوا۔

ستمبر 2008ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ، پنجاب میں قائم ،تحریک ختم نبوت نے رمضان کا ایک کلینڈر جاری کیا جس کی 70 فی جگہ احمدیوں کو کافر، لعنتی اور مرتد قرار دیتےہوئےان کے خلاف نفرت آمیز پراپیگنڈے کے لیے مختص کی گئی تھی۔

پانچ جون 2008ء کو پنجاب میڈیکل کالج(PMC)کے پرنسپل نے 15 احمدی طالبات اورآٹھ طلبہ کو یونیورسٹی میں احمدیہ مذہب کی تبلیغ کے الزام میں کالج سے خارج کردیا۔ اسی روزمذکورہ سکول کے طالب علموں نے تمام احمدی طالب علموں کو کالج سے نکالنے کا مطالبہ کرتے ہوئے ہڑتال کی تھی۔ کالج کی طرف سے اس مسئلے کے حل کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ۔ اکتوبر 2008ء میں پنجاب کے محکمہ صحت نے 23 احمدی طالب علموں میں سے 15 کو PMC میں تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔زیر نظر رپورٹ کے مکمل ہونے تک وہ طالب علم کالج جارہے تھے اور طالبات ایک ہوسٹل میں رہ رہی تھیں۔ حکومت نے وزیر اعلیٰ پنجاب کی منظوری سے دوسرے آٹھ طالب علموں ، تین طلبہ اور پانچ طالبات کو کسی دوسرے کالج میں منتقل کرنے کے لیے ایک نوٹیفکیشن جاری کیا ۔ان غیر احمدی طالب علموں یا اساتذہ میں سے کسی کے بھی خلاف کوئی مقدمہ درج نہیں کیا گیا جن کا ان ہڑتالوں اور بلوے میں ہاتھ تھا۔

ستمبر 2008 کو احمدیوں کے خلاف سالانہ ختم نبوت کانفرنس لاہور، پنجاب میں منعقد ہوئی جہاں علماء نے اعلان کیا کہ احمدیت کے خلاف ان کی تحریک اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ملک سے اس کا خاتمہ نہیں ہوجاتا۔

زیر نظر رپورٹ کی تیاری کے دوران عیسائیوں کے خلاف تشدد اور انہیں ہراساں کرنے کے واقعات جاری رہے۔

نواپریل 2009ء کو سرگودھا کی سیشن کورٹ نے اس مسلمان شخص کی گرفتاری کا حکم دیا جس پر چھ نومبر 2008ء کو پنجاب کے ضلع سرگودھا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بندوق کی نوک پر اپنے ایک عیسائی کرایہ دار کی بیٹی کی عصمت دری کا الزام تھا۔

چھ اپریل 2009ء کو ایک اور واقعہ میں پولیس نے ان چھ حملہ آوروں میں سے چار کوگرفتار کیا جن پرجنوری 2009ء میں چیچا وطنی میں عیسائیوں پر حملے کے الزام تھا۔انہوں نے چیچا وطنی میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے گھروں پر دھاوا بولا تھا اور ایک 14 سالہ عیسائی لڑکی کی اس کے گھر والوں کے سامنے اجتماعی آبروریزی کی تھی۔ یہ گرفتاریاں،متاثرہ افراد کے مسلمان آجر ،اینٹوں کے بھٹے کے مالک ،محمد اکرم خان کی جانب سے مشتبہ افراد کے خلاف ایک مقدمہ درج کرانے کے بعد عمل میں آئیں۔اکرم خان نے بقیہ دومشتبہ افراد کو بھی انصاف کے کٹہرےمیں لانے کا عزم ظاہر کیا۔ پولیس نے چرائی جانے والی اشیاء برآمد کرکے عیسائی خاندانوں کو واپس کردیں۔

اپریل 2009ء کو ننکانہ صاحب ،پنجاب کی ایک ضلعی عدالت میں پولیس نے وقوعہ کے عینی شاہدوں کے بیانات اور طبی ثبوت کے باوجود ان تین افراد کو بے گناہ قرار دیا جن پر ایک 13 سالہ عیسائی لڑکی کی آبروریزی کا الزام تھا۔ وقاص صادق اور یوسف صادق نے محمد شہباز کی مدد سے مبینہ طور پر لڑکی کو دومرتبہ اغوا کرکے اس کی زبردستی آبرو ریزی کی تھی اورلڑکی کو اس بارے میں حکام کو کچھ بتانے کی صورت میں جان سے

مارنے کی دھمکی دی تھی ۔ لڑکی کے وکلاء نے مشتبہ افراد کے رشتے داروں پر پولیس کو رشوت دینے کا الزام عائد کیا ۔

مئی 2008ء میں حافظ آباد میں ایک مسلمان لڑکی کے خاندان نے مبینہ طور پر ایک عیسائی شخص ، عدیل مسیح کو ، جس کا اس لڑکی کے ساتھ کوئی تعلق تھا، اذیت کا نشانہ بنایا اور قتل کر دیا ۔جولائی 2008ء میں پولیس نے قتل کے سلسلے میں لڑکی کے والد اور چچا کو گرفتار کیا، مگر یکم اپریل 2009ء کو گوجرانوالہ کی سیشن کورٹ نے مشتبہ افراد کو تمام الزامات سے بری کردیا۔

مارچ 2009ء میں گوجرانوالہ، پنجاب کے ایک دیہات، سانگووالی میں ایک گھرجاگھر اوراس کے اردگر واقع آبادی پر حملے کے نتیجے میں ایک عورت ہلاک ہوگئی۔اس حملے کے بارے میں خیال تھا کہ وہ ایک عیسائی کی جانب سےاس مقامی مسلمان کے خلاف ڈکیتی کی شکایت درج کرانےکی وجہ سے کیا گیا تھا ، جو اپنے دوستوں کے ساتھ کمیونٹی پر اندھا دھند ٹوٹ پڑا تھا ۔

جون 2008 ء کو ملتان میں 13 اور 10 برس کی دو بہنوں کو، اپنے ایک رشتے دار کے ہاں جاتے ہوئے ، راستے میں اغوا کرلیا گیا۔ اغواکاروں میں سے ایک نےمبینہ طور پر بڑی لڑکی سے شادی کرلی اوریہ بیان دیتے ہوئے دونوں لڑکیوں کو اپنی تحویل میں رکھنے کی درخواست کی کہ انہوں نے اپنی مرضی سے عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہے۔ بڑی لڑکی نے عمر کے بارے میں اپنے والدین کے دعوے کے باوجود لاہور ہائی کورٹ میں یہ بیان دیا کہ وہ 17 سال کی ہے اوراس نے اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کرکے شادی کی ہے۔ ستمبر 2008ء میں جج نے اپنے فیصلے میں چھوٹی لڑکی کو اس کے عیسائی والدین کی تحویل میں دینے اوربڑی لڑکی کو اپنا فیصلہ خود کرنے کی اجازت دی۔ بڑی لڑکی نےاپنے نئے خاوند کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔اکتوبر 2008 ء کو چھوٹی لڑکی نے یہ بیان دیا کہ ان دونوں کی عصمت دری کی جاتی رہی ہے اور ان سے زبردستی اسلام قبول کرایا گیا تھا۔ لڑکیوں کے خاندان کی طرف سے پیش ہونے والے تین وکیلوں کو ، لاہور کی عدالت میں آتے جاتے ہوئے دھمکیاں دی گئی تھیں۔

زیر نظر رپورٹ کی تکمیل کے عرصے میں ہندوؤں کو معاشرتی تشدد کا سامنا کرنا پڑا، جس کا ہدف اکثر اوقات مندربنے۔اپریل 2009ء میں اخبار ‘ڈان ’ نے خبردی کہ انتہاپسندوں نے بھارتی سرحد کے قریب ہندوؤں کے ایک مذہبی تہوار، ہولی کے موقع پر حملہ کر کے ایک ہندو مندر کو نذرآتش کیا اور کئی دکانیں تباہ کردیں۔ اس معاشرتی تشدد کی ایک وجہ بھارتیوں یا بھارتی نژاد سمجھے جانے والوں کے خلاف تعصب تھا۔

صوبہ سندھ میں رہنے والی ہندو کمیونٹی نے رپورٹ دی کہ وہ تاوان کی غرض سے اغوا کے بڑھتے ہوئے واقعات کا نشانہ بن رہے ہیں ، تاہم اغوا کے واقعات میں ملک بھر میں نمایاں اضافہ ہوا ہے ۔ جرائم پیشہ افراد نے ہندوتاجروں کو اغوا کا ہدف بنایا، بالخصو ص کراچی ، سندھ میں ۔ ہندوؤں کا کہنا تھا کہ وہ اس لیے تاوان ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ پولیس، اغوا کا نشانہ بننے والوں کی بازیابی کے لیے بہت کم کوشش کرتی ہے۔

فاٹا میں سکھوں کے خلاف حالیہ حملوں کے باوجود ، سکھ کمیونٹی کے خلاف معاشرتی تشدد کے واقعات نسبتاً بہت کم رہے۔

اسماعیلیوں کا کہنا تھا کہ انہیں اپنی مقابلتاً بہتر معاشی حیثیت کی بنا پر، سنی مسلمانوں کی ناراضگی کا سامنا رہتا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ ان پر اکثر اوقات عبادت کے روایتی اسلامی طریقے اپنا نے یا پھر معاشرتی بائیکاٹ کاخطرہ مول لینے کے معاشرتی دباؤ رہتا ہے۔

اگر چہ ملک میں کسی یہودی کمیونٹی کی موجودگی کے بارے میں کوئی علم نہیں ہےمگرمقامی زبانوں کے پریس میں صیہونیت کے خلاف مضامین عام ملتے ہیں ، خاص طورپرسنسنی خیز اور عام دلچسپی کا مواد چھاپنے والے اخبارات میں۔

کچھ سنی مسلم تنظیموں نے احمدیوں، شیعہ مسلمانوں ، دوسرے سنی فرقوں اور ہندوؤں کے خلاف تشدد کی اپیل پر مبنی مواد شائع کیا ۔کچھ اخباروں نے مذہبی اقلیتوں، خاص طورپر احمدیوں، ہندوؤں اور یہودیوں کے خلاف توہین آمیز مواد پر مبنی مضامین کثرت سے شائع کیے۔

ملازمتوں میں مذہبی وابستگی کی بنیاد پر بڑے پیمانے پر امتیازی برتاؤ کا اظہار ہوا ۔ عیسائیوں کو کم تردرجے کے کاموں کے علاوہ دوسری ملازمتیں ڈھونڈنے میں دشواری کا سامنا ہوا ، اگرچہ عیسائی سرگرم کارکنوں کا کہنا تھا کہ حالیہ برسوں میں نجی شعبے میں صورت حال کچھ بہتر ہوئی ہے۔

سیکشن -IV ۔ امریکی حکومت کی پالیسی

امریکی سفارت خانوں کے عہدے داروں نے مذہبی آزادی کے فروغ او ر توہین مذہب کے قوانین ، حدود آرڈیننس ، صوبے سرحد میں NAR کے نفاذ ،سرکاری تعلیمی نصاب اور مدرسوں کے تعلیمی نظاموں کی اصلاح ، احمدی اور عیسائی کمیونٹیوں کے ساتھ برتاؤ اور فرقہ وارانہ تشدد پر بات چیت کے لیے حکومتی، مذہبی اور اقلیتی کمیونٹی کے نمائندوں سے مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھا ۔ سفیر سمیت ،سفارت خانے کے عہدےداروں نے مذہبی آزادی کے مسائل پر کام کرنے والے تمام مذہبی گروپوں اور □□غیر سرکاری اداروں کے راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں ۔ سفارت خانے کے عہدے داروں نے پارلیمنٹ کے ارکان سےاحمدیوں کے ساتھ برتاؤ کے معاملے پر بھی گفتگو کی ۔

امریکی حکومت نےسرکاری تعلیم کی مجموعی اصلاح کے اپنے نو کروڑ ڈالر (سات ارب 27 کروڑ روپے) کی مالیت کے ایک پروگرام کے سلسلے میں تعلیمی نصاب کی اصلاح کے سرکاری منصوبےکے لیے، جس میں مذہبی عدم رواداری کی تعلیمات کا خا تمہ شامل تھا، بھاری مالی مدد فراہم کی ۔